ہفت روزہ
ترجمان اسلام

نگران اعلیٰ
مفتی محمود

خلیفہ دوئم امیر المومنین

حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ

عالم اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد و منہاج

۷ تا ۱۳ دسمبر ۱۹۷۶ء | شمارہ ۴۹ | قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

ہفت روزہ
ترجمان اسلام
لاہور

جلد نمبر ۲۲ | شمارہ نمبر ۴۹

جمعۃ المبارک ۲۴ محرم ۱۴۰۰ھ، ۱۴ دسمبر ۷۹ء

— سرپرست —
مولانا عبیداللہ انور

— مدیر —
اکرام القادری

— مدیر معاون —
عمیر الہاشمی

بدلِ اشتراک
سالانہ
۶۵ — روپے
ششماہی
۳۳ — روپے
سہ ماہی — ۱۷ روپے

قیمت
ایک روپیہ پچاس پیسے

— یکے از مطبوعات —

خط و کتابت : ترجمان اسلام چوک رنگ محل لاہور

عبرت انگیز حادثات

چودھویں صدی ہجری کے آخری سال کے آغاز میں دو انتہائی کرب انگیز روح فرسا اور دل ہلا دینے والے واقعات رُونما ہوئے۔ عالم اسلام پر پہلی برق جہان سوز تو اس وقت گری جبکہ مرتدین کے دو سو مسلح افراد نے حرم پاک پر قبضہ کر کے خانہ کعبہ کے طواف اور نماز کا سلسلہ منقطع کر دیا اور ان کے ایک شاطر و عیار سرغنہ نے اپنے آپ کو امام مہدی کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ان مرتدین کے ناپاک قدموں سے حرم پاک کو پاک کرنے کی مہم جاری تھی اور ابھی پوری طرح عالم اسلام سنبھلنے نہ پایا تھا کہ یہ خبر آئی کہ پی۔ آئی۔ اے کا بوئنگ طیارہ ۱۵۶ افراد کو جدہ ایئرپورٹ سے لے کر اڑا اور اڑنے کے چند منٹ بعد ہی تباہ کن حادثہ کا شکار ہو گیا۔

آناً فاناً طیارے کے ٹکڑے طائف کے پہاڑوں میں بکھر گئے اور ۱۵۶ افراد لقمۂ اجل بن گئے جن میں سے ۱۰۸ پاکستانی تھے جو حج بیت اللہ کے بعد وطن واپس آ رہے تھے۔ اس حادثہ نے پاکستان کو خصوصاً اور پورے عالم اسلام کو عموماً ایک مرتبہ پھر سوگوار کر دیا۔ اس سلسلے میں اظہار رنج و غم اور حادثہ کے شہداء کے لئے مغفرت و بلندئ درجات کی دعا کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔

ذرائع ابلاغ نے تادم تحریر جو کچھ ہم تک پہنچایا ہے وہ تو یہی ہے کہ طیارہ بالکل درست حالت میں تھا اور اس میں کسی نوعیت کی کوئی فنی خرابی نہیں تھی۔

ابھی تک تو یہ بھی یقینی طور پر نہیں معلوم ہو سکا کہ اس حادثے کا شکار ہونے والے کس کس گھر کے چشم و چراغ تھے، اور یہ آفت ناگہانی کہاں کہاں برق تپاں بن کر گرنے والی ہے یہ نہیں معلوم کہ کون یتیم ہوا ہے اور کون بیوہ، کس کس کا لخت جگر اور نور چشم کس کس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغِ جدائی دے گیا ہے۔ سینکڑوں گھرانے بے تاب ہیں اور ہزاروں دل لرز رہے ہیں کیونکہ ابھی تک مرنے والوں کی مکمل شناخت نہیں ہو سکی۔ کچھ ناموں اور پتوں کے مغالطے بھی ہیں۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ اب سوائے صبر و شکر کے چارہ کار ہی کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس حادثہ کو رفت و گذشت نہیں کر دینا چاہیئے جیسا کہ ہماری قومی عادت بن چکی ہے، بلکہ

ہم سب کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے جو ہماری زندگی سے نکلتی جا رہی ہے۔

اسی دوران یہ خبر بھی آئی ہے کہ نیوزی لینڈ کا ایک طیارہ بھی گر کر تباہ ہو گیا ہے اور ۲۵۷ افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔ یہ حادثات آنکھوں والوں کے لئے اپنے اندر بہت سی بصیرتیں اور عبرتیں رکھتے ہیں لیکن انسان غفلت کی انتہاء کو پہنچ گیا ہے۔

از: علامہ حامد الانصاری غازی

دار العلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس

علم کا سفر

جبلِ نور کی چوٹی پر مقدس غارِ حرا کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی:

اقرأ باسم ربك الذي خلق

○ تمام الہامی کتابوں اور مذہبی صحیفوں میں قرآن ہی وہ واحد صحیفہ ہے جس کا پہلا حکم "اقرأ" ہے۔ جس کی رُو سے تعلیم کو انسان کا پہلا فرض قرار دیا گیا ہے۔ نبی اُمّی کو خطاب ہے "پڑھیے" تاکہ آپ کی اُمت تعلیم کو نصب العین سمجھے اور زمانۂ جاہلیت کا خاتمہ کر کے زمانۂ علم کی بنا قائم کرے۔

سورۂ اقرأ میں "اقرأ" کا لفظ اور اس کی پانچ آیتیں اوّلین و آخرین کے علوم پر حاوی ہیں۔ زمانۂ حال کے ایک مصری مفسر کی رائے ہے کہ

"اقرأ کے لفظ میں ایٹمی علوم اور توانائی کا خزانہ موجود ہے اور یہ لفظ ماضی، حال، مستقبل کے تمام علوم پر حاوی ہے۔ تاریخ اسلامی کے تمام دار العلوم، مدارس اور یونیورسٹیاں اسی چھوٹے سے لفظ میں سمائی ہوئی ہیں"۔

وحی علم الٰہی کا نور ہے جس میں روشنی بھی ہے اور عالم ملکوت کی آواز بھی۔ یہ آواز کبھی مدھم اور کبھی صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز اتنی وزنی ہے کہ زمین کی چٹانیں اس کے بوجھ کو محسوس کرتی ہیں۔ نبوت کے قلب ہی کی خصوصیت ہے کہ اس بوجھ کو اٹھاتا ہے اور تعلیم کے ذریعے تمام انسانوں پر تقسیم کر دیتا ہے۔

زمانۂ حال میں "نظریۂ ارتقاء" کا بڑا زور ہے۔ ارتقاء کا بنیادی اصول ہمیشہ سے کائنات میں موجود ہے اور اس کی پوری تاریخ تعلیم ہی سے بنی ہے۔ علمی ارتقاء کے اس دور میں دوربینوں نے آسمان کو ہم سے دور کر دیا ہے۔ آج جتنا بڑا عالم ہے اسی میں روشنی گزرنے کے لئے بھی پانچ کروڑ سال کی ضرورت ہے۔ اسلام کی رُو سے عالم کی وسعت اس سے بھی زیادہ ہے، لیکن اقرأ کے لفظ سے الٰہی علوم اور تعلیم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ زمان و مکان کی ان تمام وسعتوں پر حاوی ہے۔

دنیا کے تمام صحیفوں اور کتابوں میں جس کتاب نے سب سے زیادہ علوم پھیلائے اور جسے سب سے زیادہ لوگوں نے پڑھا وہ قرآن مجید ہے۔ اس کے بعد احادیث ہیں صحاح، سنن اور مسانید اور اس کے بعد صحابہ کرام اور ائمہ ھُدیٰ کے علوم ہیں۔ یہ علوم لاکھوں کروڑوں سینوں میں آج جس طرح محفوظ ہیں دنیا کی تعلیمی تاریخ ان کا نمونہ پیش کرنے سے معذور رہی ہے۔

علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب "المشوق الی علوم القرآن" میں لکھا ہے کہ قرآن قرأت الحوض سے ماخوذ ہے۔ یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب حوض پانی سے لبریز ہوتا ہے۔ چونکہ قرآن تمام علوم معارف اور حقائق عالم سے پُر ہے اس لئے اس کا نام قرآن ہے۔

انگلستان میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے "وہاٹ ہیپن ان ہسٹری" (WHAT HAPPEN IN HISTORY) تاریخ کی سرگزشت نام ہے۔ کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ قرآن کا مصنف کوئی بھی ہو وہ اپنے زمانے میں بڑا تمام زمانوں کا معلم ہے۔ اس کا مطالعہ کائنات محیط اور حیرت انگیز ہے۔ وہ ہر شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اپنا بنا لیتا ہے بین الاقوامی حکومتوں اور پارلیمنٹوں کے لئے قرآن سے زیادہ کوئی کتاب رہنمائی کا فرض انجام نہیں دے سکتی۔"

امام شاہ ولی اللہ دہلوی "الفوز الکبیر" تحریر فرماتے ہیں کہ

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم قرآن کی تعلیم قرنِ اوّل کو دی اور انہوں نے قرنِ ثانی تک پہنچائی۔ اس طرح یہ تعلیم ہم تک پہنچی"۔

اقرأ کا پہلا دار العلوم بیت اللہ تھا اور دوسرا دار العلوم حرم نبوی، حضرات صحابہؓ میں اوّلین علماء حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، صاحب النعلین حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار سُن کر قرآن مجید کی ستر سورتیں یاد کر لی تھیں، سید القراء کاتب وحی حضرت ابی بن کعبؓ قرآن کے مفسر اوّل ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ تھے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد سلسلہ علم کے پانچ طبقے ہوئے جن میں مجاہد ابن جبیر (حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد)

بن جبیر، حسن بصری، عطاء بن دینار، سفیان ثوری، ابن ابی حاتم، عبدالرزاق، محمد ابن جریر طبری، زجاج قرطبی رازی، امام راغب اصفہانیؒ، ماوردی، غزالی، ابن الجوزی، ابن الولی، ابو حیان اندلسی، مجدالدین فیروز آبادی، امام جعفر صادق، امام مغیرہ عثمانی، امام اوزاعی، امام ذہبی، عبداللہ ابن عمر، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام ابن طاؤس، امام ثوری، امام ابوداؤد، امام تستری، امام یحییٰ مصمودی، ابن قیم، ابن تیمیہ، امام ابن الجوزی (جو اپنی پھوپھی کی توجہات سے دس سال کی عمر میں تمام علوم پڑھا چکے ہوئے) اور حافظ ابن عساکر دمشقی رحمہم اللہ جنہوں نے ۸۰ خواتین اُمت سے سند حدیث حاصل کی تھی جس سے اُن کی درسگاہِ علم میں عورتوں کا مقام متعین ہوتا ہے۔

حرم نبوی کے مدینۃ العلم کا یہ قافلہ قاہرہ، قزوین، قرطبہ، دمشق، بغداد، رے، شیراز، سمرقند، تاشقند، بخارا، قازان ہوتا ہوا ملتان، ٹھٹھہ اور پاکپتن وارد ہوا اور وہاں سے دہلی پہنچا۔ اس زمانے میں دہلی پورا ایک دارالعلوم تھا۔ سلطان جی (سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء) کی خانقاہ معارف پناہ میں میر خورد کرمانی کا دارالعلوم تھا جس سے مولانا فخر الدین اور مشارق الانوار کے مصنف علامہ رضی الدین صغانی ۶۵۰ھ ایسے امام حدیث کا نام نمایاں ہے۔

میر کرمانی کے اس مدرسہ کی برکت سے امام ولی اللہ الدہلوی کا خاندانی مدرسہ 'مدرسہ رحیمیہ' دارالعلوم کے درجہ تک پہنچا۔ اس دارالعلوم سے شاہ محمد اسحاقؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالغنیؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جیسے مفسر، محدث، فقیہہ اور مجاہد پیدا ہوئے۔

علم کا یہ سفر تیرھویں صدی میں جاری رہا۔ مدرسہ رحیمیہ کے نور نے دارالعلوم دیوبند کو روشنی بخشی، قطب وقت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی اور شیخ العصر مولانا رحمۃ اللہ کیرانویؒ اور امت کے دوسرے بزرگوں کی دعاؤں سے ایک ایسی بزرگ اور برگزیدہ ہستی کا ظہور ہوا جسے جبل نور کی بلندی سے وہ سب کچھ مل گیا جسے اس دور کی ضرورت تھی۔ اسے نہ نام و نمود کی ضرورت تھی نہ اپنے فضل و کمال کی نمائش کی۔ لیکن علومِ الٰہی کا جو خزانہ اس کے پاس تھا وہ کسی کے پاس نہ تھا۔ کلمۃ اللہ کی سربلندی اسلامی علوم کا احیاء اور عالمگیر اسلامی دعوت کا داعیہ اس کی روح کا تقاضا تھا۔ کتاب اللہ اس کے علوم کا سرچشمہ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے علوم کا سرمایہ تھا۔ اس کے رفقاء وہ عظیم روحانی بزرگ تھے جو کتاب و سنت اور اسرارِ شریعت کے حامل تھے۔ اس طرح خدا کے نیک بندوں کی ایسی جماعت تیار ہو گئی جو اپنے علم و عرفان اور روحانیت کے اعتبار سے اس صدی کے زوال کو عروج سے بدلنے کی خداداد صلاحیت رکھتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی کے بعد خدا کی مشیت نے رہنمائی کی اور امام وقت نے یہ فیصلہ کیا کہ لال قلعہ جامع مسجد، مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کی ایک ضمانت ہے اور وہ ہے تعلیم اور تعلیم کے لئے ایک مرکزی دارالعلوم کا قیام، اس زمانے میں ہر قصبہ میں ایسے مخلص بزرگ موجود تھے جو درس اور مکتب قائم کرنے کا خیال رکھتے تھے لیکن وہ صرف ایک اور ایک ہی ذات تھی جسے دن کی روشنی اور رات کی تنہائی میں ایک ہی دھن تھی ایک ایسے دارالعلوم کی بنیاد جس کی سرحدیں کسی مسجد یا مدرسہ کی چہار دیواری میں محصور نہ ہوں بلکہ اس کا قیام آزاد کھلی ہوئی فضاء میں ہو جس کا قدم اٹھے تو میلوں تک آگے جائے اور دامن پائے کروٹ لے تو اس میں بستیاں سما جائیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سرسید مرحوم، طبیہ کالج دہلی کے بانی مسیح الملک حکیم اجمل خان دہلوی، حضرت مولانا حکیم سید عبدالحیٔ لکھنوی اور اعیان دیوبند کے سربراہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی نے ہمیں دارالعلوم دیوبند کے بانی کا نام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بتایا ہے اور اکابر دیوبند نے حضرت نانوتویؒ کے نام نامی کو اللہ کا انعام اور رجوع الی اللہ کا پیغام سمجھا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کا ارشاد ہے کہ ہر دور کا اپنا ایک ظہور ہوتا ہے اور یہ ظہور کسی تاریخی شخصیت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں یہ ظہور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی بابرکت شخصیت کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اسلامی دنیا کے لئے علم کی ایک اعلیٰ مثال تھے جن کی آفاقی روحانیت اور تعلیمی نصب العین نے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں انار کے ایک درخت کے نیچے پہلے ایک مکتب اور چند سال بعد دارالعلوم دیوبند جیسے ایک جامعہ کی صورت اختیار کر لی۔ آنے والی صدی میں مسلمانانِ ہند کی بقاء، تشخص اور انفرادیت کی ضمانت کے اس عظیم منصوبے کو بروئے عمل لانے میں حضرت نانوتویؒ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت حاجی عابد حسینؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور محمد یعقوبؒ جیسے بزرگوں کی دعائیں اور عملی تعاون حاصل تھا۔

چنانچہ یہی وہ دارالعلوم ہے جو اس پوری ایک صدی میں بالخصوص برصغیر (پاک و ہند اور بنگلہ دیش) میں اور بالعموم ایشیاء اور افریقہ کے مختلف حصوں میں اپنی ہزاروں شاخوں اور رشد [illegible] فضلاء کے ساتھ [illegible] اور [illegible] میں [illegible] حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا عزیز الرحمٰنؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام مجاہد کبیر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد انصاریؒ، شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاریؒ اور دینی نظام

دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، مبلغ اعظم مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، محدث العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مجاہد جلیل حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مجاہد کبیر حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، استاذ العلماءؒ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ، حضرت مولانا عبدالرزاق انصاریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، حضرت مولانا سید محمد میاں، علامہ تاجور نجیب آبادیؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوریؒ، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ، مفتی مہدی حسنؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندیؒ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا رسول خانؒ، حضرت مولانا عزیر گل صاحب (اسیر مالٹا) مدظلہٗ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا عبدالرزاقؒ (قاضی القضاۃ صدر سپریم کورٹ افغانستان)، حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت بہار، حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؒ، استاذ القراءؒ حضرت مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ، حضرت مولانا سید مبارک علیؒ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مبارک حسینؒ محدث دارالعلوم میرٹھ، حضرت مولانا فضل ربی پکھلوی ممبر پارلیمنٹ افغانستان، حضرت مولانا اختر شاہ خان صاحبؒ میرٹھی وغیرہ کے نام موجود ہیں۔

دارالعلوم کے اپنے خیر القرون میں دو تین اجلاس "جلسۂ دستاربندی" کے نام سے منعقد ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ کا آخری اجلاس ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور شوریٰ کے بزرگ ارکان نے جو مسلمانانِ ہند کے لئے مجلس اسلامی اعلیٰ کے ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں پہلی بار ۱۳۷۱ھ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم کی تجویز پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دارالعلوم کی صد سالہ تقریب بڑے پیمانے پر اس کے شایانِ شان منائی جائے۔ اس فیصلے کے پورے بیس سال بعد اکابر دارالعلوم نے یہ اجلاس منعقد کرنے کے لئے ۱۳۹۵ھ میں خاص کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کی تجاویز منظور کر کے قطعی فیصلہ صادر فرمایا۔

بزرگ اساتذہ اور عزیز طلباء، اور کچھ عمائدین شہر کی دعاؤں کے بعد سلسلے کے مشتر اکابر سے رجوع کیا گیا اور ان کی دعائیں اس اجلاس کے لئے حاصل کیں۔

یہ اجلاس ایک ایسے وقت میں منعقد ہو گا جبکہ چودھویں صدی ختم ہو رہی ہو گی اور نئی صدی تاریخ کے دروازے پر دستک دے رہی ہو گی اور علم و عمل کی قوتوں کو اپنے تقاضوں کی تکمیل کے لئے للکار رہی ہے۔ عالم انسانیت نظریات کے جنگل میں تاریخ کے ایک موڑ پر قیادت کا منتظر ہے۔ ایسے میں یہ صد سالہ اجلاس انشاء اللہ احیاءِ علوم اسلامیہ، اجتماع علماءِ مسلمین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا نقیب ہو گا اور دارالعلوم کی نئی ذمہ داریوں کا تعین کرے گا۔ اس اجلاس کے انتظامات بھی اتنے ہی زبردست ہوں گے جتنا یہ اجتماع عظیم اور نمائندہ ہو گا۔ اسلامی دنیا کی بھرپور نمائندگی یقینی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس میں علی گڑھ، ندوہ، جامعہ ملیہ، مظاہر العلوم، جنوب کے باقیات اور جنوب کی تعلیمی تحریکات کی موثر نمائندگی ہو گی اور مشرقی اور مغربی تمام تعلیمی اداروں، مدرسوں اور کالجوں کو شرکت کا موقع ملے گا۔

اجلاس کا نصب العین:

اسلام کی آفاقی تعلیم اور اسلامی علوم کے ذریعے:

- اعلائے کلمۃ اللہ — کلمۃ اللہ ہی العلیا
- دعوت الی اللہ
- دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر علم کی تاریخ تعلیمی، تبلیغی اور ملی خدمات کا گذشتہ سو سالہ جائزہ
- آئندہ سو سال کی ترقی کا منصوبہ
- اسلامی دنیا کے علماء کا اتحاد (اسلامی اتحاد کے دائرہ میں (انسانیت کے بہترین مفاد اور عالم بہبودی کے لئے)۔

مقاصد:

- احیاء العلوم اسلامیہ
- اس جوہری دور میں اسلامی علوم کی جوہری تعلیم و تربیت کا احیاء اور اس کے ذریعے مسلمانانِ عالم کی علمی، فکری، حسی، نظری، فنی اور ایجادی قدروں اور صلاحیتوں کو نئے سرے سے دریافت کرنے کے لئے علمی اور تحقیقی جد و جہد کرنا۔
- قدامت کے کھنڈروں میں دبے ہوئے اسلام کے اصلی، اخلاقی، روحانی اور مادی خزانوں کو دنیا کے تہہ خانوں اور کتب خانوں سے برآمد کرنا اور انہیں اسلامی زندگی کی تعمیر نو اور عام انسانی بہتری کے لئے بروئے کار لانا۔
- اسلامی تعلیم کے ذریعہ ایسے رجال کار علماء، فضلاء، شیوخ، قضاۃ، اربابِ فتویٰ، مدرسین، مبلغین، مورخین، خطباء، ائمہ مساجد، شعراء، ادباء، صحافی، فلسفی اور سائنس دان تیار کرنا جو نئے دور کی لادینی تعلیم، لادینی فلسفہ اور لادینی لٹریچر کا پورا پورا مقابلہ کر سکیں۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اہم نصب العین کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جن کی زندگی ایمان و یقین اور اخلاص ایثار کا نمونہ ہوں۔ جن کے نیک کردار آج کے انسان کے لئے اسوۂ حسنہ ہو اور جن کے چہروں پر خیر القرون کا نور ہو اور یہ نور تاریخ کی سب سے سچی گواہی دے کہ اسلام ساری دنیا کے لئے رحمت ہے اور اسلامی علوم تباہ حال انسانی معاشرہ کو تباہی سے بچا کر زندگی کی جوہری توانائی عطا کر سکتے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے

باقی صفحہ ۳۰ پر

زاہد بلند شہری

رانگ نمبر

جب تک ٹیلیفون نہیں تھا تو ٹیلیفون سُننے اور کرنے کی چاہ عروج پر تھی اور حد تو یہ کہ اگر ہم کسی کے گھر مہمان بن کر جاتے تو اس شوق کو وہاں بھی نہ چھوڑتے۔ گو ہمارا اور اس شوق کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اور اگر ٹیلیفون سننے اور کئے بغیر کافی عرصہ گزر جاتا تو چوری چھپے ٹیلی فون بوتھ پہنچتے اور یوں فون کی پیاس بجھاتے۔ ہمارے اِس شوق کو دیکھتے ہوئے والد محترم نے ایک عدد ٹیلیفون گھر پر لگوا ہی دیا۔ یہ تذکرہ نہ ہو تو بہتر ہے کہ ٹیلیفون لگوانے میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے!

خیر اب گھر میں ٹیلیفون لگ چکا تھا۔ ظاہر ہے ٹیلیفون کرنے کی کھلی آزادی تھی۔ ابتدا میں تو ہم نے پاکستان بھر میں کوئی عزیز نہیں چھوڑا جسے ٹیلیفون نہ کرلیا ہو اور تو اور ایسے رشتہ داروں میں بھی ٹیلیفون گھمایا جو ہمیں جانتے تک نہیں اور یہ رشتہ داری محض یک طرفہ ہے۔ اور جب رشتہ داروں کے نمبر ختم ہو گئے تو پھر ٹیلیفون ڈائریکٹری میں سے جو چاہا نمبر نکالا اور کر دیا اور متعدد مرتبہ تو ہمیں ٹیلیفون ریسیور میں سے گالیاں بھی سننے کو ملیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ شوق کم ہوتا گیا یہاں تک کہ یہ شوق بالکل ختم ہو گیا۔ اور پھر ٹیلیفون سے ایسی نفرت ہو گئی کہ اس کی گھنٹی بجتی ہوئی زہر محسوس ہوتی تھی۔

پڑھتے پڑھتے گھنٹی سنائی دے رہی ہے، کھانا کھا رہے ہیں تو سنائی دے رہی ہے، جوتا پہن رہے ہیں تو سنائی دے رہی ہے اور کچھ "خوش ذوق" رات کو سوتے میں ہمیں ٹیلیفون کے ذریعے تنگ کر رہے ہیں۔ غرض کہ بعض اوقات جی چاہتا کہ فون کٹوا دیا جائے اور اس دن کو یاد کر کے ہم خوب کوستے جب ہمیں یہ منحوس شوق چرایا تھا اور اسی شدتِ شوق کی وجہ سے ہماری خاطر ٹیلیفون بھی لگوایا گیا۔

اب حالت یہ ہے کہ رات اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں روزانہ بے شمار "رانگ نمبر" کی گھنٹی بجتی ہے۔ ہم یہ سوچ کر کہ کسی دوست کا فون ہوگا ریسیور اٹھاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ "رانگ نمبر" ہے غلطی سے مل گیا۔ "سوری پلیز"

اگر ہم یہاں ان رانگ نمبرز کی گفتگو نقل کریں تو یہ صفحات ناکافی ہیں۔ بہرحال آپ کی دلچسپی کے لئے چند "رانگ نمبر" اور "سوری" کی کالوں کی گفتگو دے رہے ہیں۔

"ٹرن ٹرن ٹرن۔"

"ہیلو! کون صاحب! ہیلو ہیلو.. آواز نہیں آرہی! زور سے بولئے۔"

"آپ نے کس سے بات کرنا ہے۔"

(دوسری طرف سے آواز آتی ہے) "سامنے والی دودھ کی دوکان سے حمیدے کو بلا دیجئے۔"

"یہاں کوئی دودھ کی دوکان نہیں ہے آپ نے غلط رِنگ کیا ہے۔"

(دوسری طرف سے آواز آتی ہے) "پھر آپ کا کیا ہے۔ ہیلو! میرا مطلب ہے پھر آپ کا نمبر کیا ہے؟"

آپ کو ہمارے نمبر سے کیا مطلب!

(دوسری طرف سے) "جی میں تو ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

ویسے ہی کے بچے! کیوں ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔

۲۔ ٹرن ٹرن"

"ہیلو! السلام علیکم!"

(دوسری طرف سے بلا رکاوٹ) اکرم کیا حال ہیں بھئی! کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی! یار ویسے ٹائم مجھے نہیں ملتا۔ اب دیکھو نا بھابھی (تمہاری) بھی مجھے بہت ہی تنگ کرنے لگی ہیں۔ کبھی چینی کی شکایت کرتی ہیں۔ کبھی کہتی ہیں دروازے کے آگے فرش بنواؤ! یار تم ہی بتاؤ سیمنٹ تو مل نہیں رہا کیسے بنواؤں!

(اِدھر سے) ہیلو! کیا فضول گفتگو کر رہے ہیں آپ! آپ نے کس سے ملنا ہے!

(دوسری طرف سے) جی میں منیجر حبیب بنک اکرم صاحب سے بات کر رہا ہوں۔ آپ کون ہوتے ہیں روکنے والے۔

(اِدھر سے) جناب یہ رانگ نمبر ہے۔ پوچھے بغیر ہی آپ گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔

۳۔ ٹرن ٹرن ٹرن۔ ٹرن ٹرن ٹرن

ادھر سے جان بوجھ کر خاموشی۔

مجبوراً اٹھاتے ہیں۔ ہیلو ہیلو جی! حمید صاحب

(دوسری طرف سے) حمید نہیں حامد

(اِدھر سے) یہاں کوئی حامد وامد نہیں ہے۔ یہ نمبر غلط مل گیا ہے۔

(دوسری طرف سے) میں خود حامد بول رہا ہوں۔ مجھے سے بات کرنی ہے۔ اس کی پھوپھی یہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ اس کے لئے کراچی سے حلوہ لائی ہے۔

(اِدھر سے) ہیلو! بات تو سنیں۔

(دوسری طرف سے) اس سے کہیں کہ مزدوراں دی کھوئی پہنچے۔

(ادھر سے) ہیلو ہیلو!

(دوسری طرف سے) یار پہلے پوری بات سن لو، پھر جی بھر کے ہیلو ہیلو کر لینا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ آج مزدوراں دی کھوئی آئے ورنہ حلوہ خراب ہو جائے گا۔ ہاں اب بتاؤ کیوں ہیلو ہیلو کی رٹ لگائے ہوئے تھے؟

(ادھر سے) آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟

(دوسری طرف سے) یار حد ہو گئی میں بھی تجھے بھولا تو نہیں بھائی! میرا ابھی خون سفید نہیں ہوا۔

(ادھر سے) آپ فضول بات نہ کریں، یہ بتائیں کہ آپ نے کہاں رنگ کیا ہے؟

(دوسری طرف سے) میں نے گوشت مارکیٹ میں کلو کی دوکان پر کیا ہے۔

(ادھر سے) بھئی یہ گوشت مارکیٹ نہیں ہے۔ یہ رنگ محل ہے رنگ محل سمجھے۔

(دوسری طرف سے) تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میرے پیسے بھی ضائع گئے۔ عجیب آدمی ہو سنتے جا رہے ہو بتا نہیں رہے۔

۴۔ ٹرن ٹرن! ہیلو!

(دوسری طرف سے خاتون بولتی ہیں)۔

محکمہ تعلیم؟ یہ بتائیے کہ کل کی چھٹی ہے یا نہیں؟ اب دیکھئے نا ہم کتنی دور سے اسکول پڑھانے آتی ہیں۔ اگر آج ہی پتہ چل جائے تو پھر کل کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ ویسے دوسرے سکول سے پتہ کیا ہے، وہاں کل چھٹی ہے۔ آپ تصدیق کر دیں۔

(ادھر سے) خاتون یہ محکمہ تعلیم نہیں ہے۔

(دوسری طرف سے) اوہ! سوری، معاف کیجئے آپ کو زحمت ہوئی۔

(ادھر سے) ہم تو صبح سے ہی یہ زحمت اٹھا رہے ہیں۔

۵۔ ٹرن ٹرن۔ ہیلو ہیلو

(دوسری طرف سے) ہیلو! ماسٹر صاحب میں نے بچے کو بھیجا تھا۔ آپ نے اسے خالی ہاتھ واپس کر دیا۔ عید آ رہی ہے۔ وہی سوٹ اس نے پہننا ہے۔

(ادھر سے) محترمہ! کیا کہہ رہی ہیں، سمجھ نہیں آ رہا۔

(دوسری طرف سے) میں کہہ رہی ہوں آپ نے سوٹ ابھی تک کیوں نہیں سیا۔

(ادھر سے) کونسا سوٹ، کیسا سوٹ؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

(دوسری طرف سے) پرسوں جو دیا تھا۔ میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔

(ادھر سے) یہ ٹیلرنگ کی دکان نہیں محترمہ!

(دوسری طرف سے) تو کیا آپ جدید ٹیلرز کی دکان سے نہیں بول رہے؟

(ادھر سے) بالکل نہیں!

(دوسری طرف سے) اوہ سوری، رانگ نمبر۔

۶۔ ٹرن ٹرن (گھنٹی بجتی ہے۔

(ادھر سے) ہیلو! کون صاحب!

دوسری طرف سے) ہیلو لو! ہیلو لو!!

(ادھر سے) جی بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے۔

(دوسری طرف سے) ابا میاں سے کہنا میں گھر دیر سے آؤں گا اور ہاں کہنا غنی آئے گا۔ اسے پانچ کلو چینی دے دینا۔ سمجھ گئے نا! چینی کی جگہ ابا میاں کو معلوم ہے۔ ابا میاں سے کہنا کہ چینی دیتے وقت ذرا احتیاط کریں۔ پہلے بھی مخبری ہو گئی تھی۔

(ادھر سے) ہیلو! کیا بات ہے بھئی! کہاں فون کیا ہے! کس سے ملنا ہے کچھ پتہ تو چلے ویسے ہی پیغام دیئے چلے جا رہے ہیں۔

(دوسری طرف سے) میں نے رشید ڈپو ہولڈر کے گھر ٹیلیفون کیا ہے۔

(ادھر سے) یہاں کوئی ڈپو نہیں ہے۔ آپ نے غلط نمبر ملایا ہے۔

(دوسری طرف سے) ہیلو! معاف کیجئے، غلط نمبر مل گیا۔

۷۔ ٹرن ٹرن ٹرن ٹرن ٹرن (مسلسل بجے جاتی ہے اور ادھر سے کوئی نہیں اٹھاتا)۔ ریسیور اس یقین کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے کہ یہ رانگ نمبر کی کال نہیں ہو گی۔

ہیلو! ہیلو!

(دوسری طرف سے) آپ عجیب آدمی ہیں آپ سرکاری ملازم ہیں کوئی خالہ جی کے گھر نہیں بیٹھے۔ اتنی دیر سے گھنٹی بج رہی ہے صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ ٹیلیفون اٹھا ہی نہیں رہے آپ کے چیف سے بات کروں گا۔ اتنی سستی دفتر میں نہیں چلے گی۔ آپ ملازم ہیں۔ کوئی لینڈ لارڈ نہیں ہیں کہ مرضی میں ہو گا تو ٹیلیفون اٹینڈ کریں گے ورنہ نہیں۔

(ادھر سے) آپ کیا بکے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کو بات کرنے کا سلیقہ ہے یا نہیں؟ ٹیلیفون کس نے دیا ہے آپ کو؟ معلوم ہوتا ہے آپ نے کبھی ٹیلیفون نہیں کیا۔ یہ رانگ نمبر ہے۔ سمجھے! آئندہ گفتگو کرتے وقت احتیاط کرنا ورنہ کوئی گلے پڑ گیا تو بچو! نانی یاد آ جائے گی۔ ایڈیٹ میں۔

(دوسری طرف سے) میں معافی چاہتا ہوں۔ دراصل کافی دیر سے ٹرائی کر رہا تھا اور اب ملا بھی تو رانگ نمبر۔

۸۔ ٹرن ٹرن ٹرن (گھنٹی)

(ادھر سے) ہیلو۔

(دوسری طرف سے) بیٹے امی سے کہنا کہ میں پارٹی پر جا رہا ہوں۔ کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔

(ادھر سے) ہیلو! یہاں کوئی بیٹا ویٹا نہیں ہے، آپ نے غلط ٹیلیفون کیا ہے۔

(دوسری طرف سے) زاہد بیٹے میں تمہارا ابو بول رہا ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں معلوم ہوتا ہے غلط فون سن سن کر تم پریشان ہو گئے ہو۔

(ادھر سے) معاف کیجئے ابو! میں نے سمجھا رانگ نمبر ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی

عالمِ اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا مقصود و منہاج

یہ تقریر ۱۲ جولائی ۷۸ء کو کراچی یونیورسٹی میں ہوئی۔ جلسہ میں یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلباء کے علاوہ ممتاز دینی، علمی، ادبی شخصیتیں، سیاسی راہنما دینی اداروں کے ذمہ دار علماء اور ادب و صحافت سے تعلق رکھنے والے معروف اصحاب شریک تھے۔
کراچی یونیورسٹی کے آرٹس آڈیٹوریم کی وسعت کو سامعین کی کثرت نے ناکافی ثابت کر دیا تھا۔ بڑی تعداد کو گیلری میں کھڑے ہو کر تقریر سننا پڑی۔
استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر احسان رشید، وائس چانسلر اور اختتامی کلمات تشکر جناب اسمٰعیل سعد صاحب رجسٹرار کراچی یونیورسٹی نے ادا کئے۔

علم ایک صداقت ہے:

جناب وائس چانسلر صاحب، اساتذہ جامعہ، طلباء و طالبات اور برادران عزیز!
اگرچہ میں علم میں تقسیم کا قائل نہیں ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی۔ اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری اور عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں۔ اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

حدیث کم نظراں قصہ قدیم و جدید

میں علم کی دینی و دنیوی تقسیم کا بھی قائل نہیں ہوں۔ میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں یا ایک انسانی تجربہ جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں اور نہ ہونی چاہئے۔ میں زندگی کے دوسرے سرچشموں کی بھی جغرافیائی، نسلی، تاریخی یا سیاسی حدبندیوں کا قائل نہیں۔ میں علم کو ایک "وحدت" مانتا ہوں اور جس کو کثرت کہا جاتا ہے اس کثرت میں بھی مجھے وحدت نظر آتی ہے۔ علم کی وہ وحدت سچائی ہے۔ سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے اور اس کو پانے کی خوشی ہے۔ اس کے باوجود میں جناب وائس چانسلر صاحب کا اور اس جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آج ان عزیز طالب علموں اور چمن اسلام کے ان شگوفوں کو خطاب کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کا (صحیح یا غلط طریقہ پر حقیقتاً یا شہرت کی بنا پر) انتساب اور تعلق قدیم طرز تعلیم سے ہے، اس لئے میں وائس چانسلر صاحب کی وسیع النظری اور آپ کے جامعہ کی اس فراخ دامانی کا معترف ہوں کہ اس نے اس میں کوئی تفریق نہیں کی۔ میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکمت کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی "وردی" پہن کر آئے وہی 'عالم' اور 'دانشور' ہے۔ اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے اور نہ لائق سماعت۔ بدقسمتی سے ادب و شاعری میں بھی یہی حال ہے کہ جو ادب کی دوکان نہ لگائے اور اس پر ادب کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے اور ادب کی وردی پہن کر مشاعرے میں کسی ادبی محفل میں نہ آئے وہ 'بے ادبی' کا مرتکب ہے۔ لوگوں نے ان پیدائشی ادیبوں اور شاعروں کا قصور بھی معاف نہیں کیا ہے جن کے جسم پر وہ وردی دکھائی نہیں دیتی یا جن کو بدقسمتی سے ان وردیوں کے گودام سے کوئی وردی نہ مل سکی ہو۔ اگرچہ میں علم کی تازگی اور علم کی آفاقیت کا قائل ہوں جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے۔ اگر خلوص ہے سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے فیضان میں کمی نہیں۔ بہرحال یہ ایک جرأت مندانہ قدم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی تقلید کی جائے۔ ہماری قدیم درسگاہوں میں جدید ماہرین کو دعوت دی جائے اور ہماری ان جامعات اور دانش گاہوں میں ان لوگوں کو یاد کیا جائے جنہوں نے خلوص کے ساتھ پڑھا ہے اور [illegible] پیدا کئے ہوئے علمی اور ادبی ذخیرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔

تعلیم کا اصل مقصد:

میں شکر گزار ہوں کہ مجھے اس بار [illegible] میں ایک ایسے مجمع کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جا رہا ہے جو کل [illegible] ملک کی بنیاد ملک تھا [illegible] سے اسلام [illegible]

کوئی اہم کردار ادا کر سکیں گے یا جن کے ہاتھ میں زمام کار آئے ۔ کم از کم تعلیم و تربیت کی رہنمائی اور سربراہی کا ان کو موقع ملے ۔ میں نے تعلیم کی غرض و غایت اور اس کے فائدے و نتیجہ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے ، لیکن میں یہاں صرف ایک حوالہ دوں گا ۔ مشہور برطانوی ماہر تعلیم (SIR PERCY NEINN) نے تعلیم کی بڑی جامع و بلیغ تعریف کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ :

"تعلیم کا بنیادی خیال پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہئے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اس نظریۂ حیات پر (جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں) اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں" "مدرسہ" کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی طاقتوں کو جو اس نظریۂ حیات سے وابستہ ہیں طالب پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علموں کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کے تسلسل و ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعے وہ مستقبل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے ۔"

میں نے تعلیم کی تعریف کے سلسلہ میں جو کوششیں دیکھی ہیں اور جو عبارتیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں میرے نزدیک سب سے زیادہ جامع اور عملی تعریف ہے ۔ تعلیم کیوں دی جاتی ہے ؟ اور تعلیم پر اعلیٰ صلاحیتیں اور قوم کی توانائیاں فیاضی کے ساتھ اور ایسے منظم طریقے پر کیوں صرف کی جاتی ہیں ؟ کیا اس لئے کہ وہ تعلیم ایک خلیج پیدا کر دے ۔ اس قوم کے معتقدات ، مقاصد اور علمی و تہذیبی سرمایہ اور ان چیزوں کے درمیان جو اس کو عزیز ہیں ، جو خیالات اس کو عزیز ہیں ۔ اور عزیز ہونے کے لئے شرط نہیں ہے جس کو جو چیز عزیز ہو ۔ یہاں یہ بحث نہیں اٹھائی جا سکتی کہ وہ چیزیں عزیز بنانے کے قابل ہیں یا نہیں ۔ لیکن جو چیزیں اس کو عزیز ہیں جو عقائد اس کو عزیز ہیں ، جو خیالات اس کو عزیز ہیں ، جو اقدار جو ویلوز (VALUES) اور جو تصورات و معتقدات (CONCEPTIONS) اور جو افکار (IDEAS) اس کو عزیز ہیں ، جو ذخیرہ اس کو اپنے اسلاف سے ملا ہے تعلیم کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ پیدا کرے ، اور قوم کی نئی نسل کی طرف اس ذخیرہ کو منتقل کرے جو اس قوم کو عزیز ہے اور جس پر اس کے اسلاف کی بہترین طاقتیں اور طویل ترین مدت صرف ہوئی ہے ، اور جن کے لئے بعض اوقات وہ قوم برد آزما ہوئی ہے ، اور اس نے اپنی جان کی ، اپنی عزت کی آبرو کی بازی لگا دی ہے ۔ یہاں یہ بحث بڑی بے موقع اور بڑی غیر ہمدردانہ ہے کہ ان قوموں نے ان اقدار کے لئے کیوں جنگ کی ۔ تعلیم یہ سرمایہ نہ صرف منتقل کرے اور طوطے کی طرح اس کو رٹا دے بلکہ اس کو اس کے قلب و دماغ میں جاگزیں کر دے ۔ اس کا ذہن اس کا ذوق اس کو قبول کرے اور جذب کرے ۔ وہ اس کے لئے خارجی اور اجنبی چیز نہ ہو بلکہ وہ اس کے لئے ایک داخلی چیز بن جائے اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مزاج بن جائے ۔

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعریف بہت جامع ہے لیکن جب ایسی ملت کا معاملہ ہو کہ وہ عقائد و اقدار اس کے اپنے بنائے ہوئے اور پیدا کئے ہوئے نہ ہوں بلکہ ان کا سرچشمہ وحی الہیٰ ہو ، ان کا سرچشمہ کلام الہیٰ ہو ، ان کا سرچشمہ نبوت ہو ، ان کا سرچشمہ وہ علم غیب ہو اور وہ علم ازلی ہو جس میں کوئی تغیر نہیں ہوگا ، تب ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے ۔ اب اگر کوئی نظام تعلیم یہ خدمت انجام دیتا ہے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ، ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر ، غفلت کی بنا پر یا کسی بڑی سازش کے تحت ۔ وہ سازش اس ملک کے اندر ہوئی ہو یا اس ملک کے باہر ہوئی ہو کر اس نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ حضرات کا عقیدہ ان تمام عقائد اور اقدار سے اٹھ جائے یا متزلزل ہو جائے ، اس کی چولیں ہل جائیں اور وہ دائمی شک میں تردد میں مبتلا ہو جائیں ۔ وہ ایک ذہنی کشمکش (MENTAL CON-FLICT) میں مبتلا ہو جائیں اور انفرادی زندگی کی حد تک نہیں بلکہ یہ کشمکش (CONFLICT) افراد کی حدود سے تجاوز کر کے اسی ملت کے میدان زندگی میں کارفرما ہو ۔ وہ اس کو متاثر کر رہی ہو اور ایک بڑی خونریز کشمکش ، ایک بڑی خونریز جنگ برپا ہو جائے اس تعلیم یافتہ نسل کے درمیان اور اقدار کے درمیان ، ان مفاہیم کے درمیان ان عقائد کے اور خیالات کے درمیان میں اسلام کو ایک ترکہ (LEA-GACY) کی حیثیت سے نہیں مانتا اور اس کو اسلام کی بڑی تعریف نہیں سمجھتا ۔ اس لئے میں (LEGACY OF ISLAM) اور (HERITAGE OF ISLAM) پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا زیادہ قائل نہیں ہوں ۔ میں اسلام کو ایک پیغام حیات سمجھتا ہوں ۔ میں اسلام کو زمانے کے ساتھ چلنے والا نہیں ، بلکہ زمانے سے آگے چلنے والا ، زمانہ کا راہبر ، زمانے کا رفیق اور شریک کار ہی نہیں بلکہ اس کا محتسب اور اتالیق (GAURDIAN) سمجھتا ہوں ۔ اس لئے جب غیر ارادی طریقے پر یا اتفاقاً یا کسی سازش کے تحت کوئی تعلیمی فتنہ یہ نتیجہ پیدا کرے کہ اس کی نسل ان تمام اقدار کے بارے میں ، ان تمام عقائد و خیالات کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جائے ، اس کا یقین اس سے اٹھ جائے ، اور وہ ان کو ایک طفل تسلی یا ڈھکوسلا سمجھنے لگے یا کم سے کم ان کو اس اقدار پر اس طرح یقین نہ ہو کہ وہ ان کی حمایت کرے ، سینہ سپر ہو ، ان کے لئے کبھی برد آزما ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ تعلیم صرف انتشار کا باعث ہے ۔

اسلامی ملک کا معاملہ

زیادہ اہم ہے:

جب میں یہاں آپ کے سامنے خطاب کر رہا ہوں تو میرے سامنے تمام اسلامی ملک ہیں۔ میرے سامنے ترکی ہے۔ میرے سامنے مصر، شام و عراق ہیں، اور میرے سامنے مملکت سعودی عربیہ بھی ہے جہاں ایک آل ورلڈ "اسلامک ایجوکیشن کانفرنس ہوئی تھی، جس میں یہاں سے احسان رشید صاحب اور لے کے بروہی بھی گئے تھے۔ میں ہندوستان کی طرف سے آیا تھا۔ وہاں میں نے جو پیپر (PAPER) پڑھا تھا اس میں میں نے اس چیز کا اظہار کیا تھا کہ معاملہ کہیں زیادہ سنگین اور نازک ہو جاتا ہے جب کسی اسلامی ملک کا معاملہ ہو۔ اسلامی ملک میں وہ مسلمان آبادی ہے جو اپنی ایک شخصیت رکھتی ہے ایک (PERSONALITY) رکھتی ہے۔ اس کی ایک ملی شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک پیغام ہے۔ اس کو دنیا میں ایک فرض انجام دینا ہے۔ اگر تعلیم وہاں اس نسل میں انتشار پیدا کر دیتی ہے اور صرف یہ خدمت انجام دیتی ہے کہ وہ نسل جب کسی جدید دانشگاہ سے پڑھ کر نکلتی ہے تو وہ اپنے معتقدات سے بے گانہ ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نئی قوم بن جاتی ہے جو کسی طریقے سے اس ملک میں فٹ نہیں ہو سکتی اور وہاں کے لئے ایک اجنبی عنصر بن جاتی ہے۔ اس سے ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہاں کی زندگی ایک نیا مسئلہ (PROBLEM) وجود میں آجاتا ہے۔ ایک نئی گرہ وہاں کے رشتہ حیات میں پڑ جاتی ہے۔ وہ ملک یا وہ ملت جس کے معتقدات اور جس کے اقدار حیات اور نقطہ فکر کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ اگر وہاں کی تعلیم کا ثمرہ اور نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ایک ذہنی انتشار ایک خونریز جنگ اور ایک زبردست کشمکش اس نئی نسل کے درمیان اور اس کے خاندان کے درمیان اس معاشرہ کے درمیان جس کا اس سے تعلق ہے ان نونہالوں اور نوجوانوں کے درمیان اس کی پوری تاریخ اور پورے کارنامے اس کے منصب و مقام کے درمیان جو خدا نے اس کو عطا کیا ہے اور مسلمانوں کا پیغام اور اس کے انجام دینے کا جو کام ہے اس کے درمیان ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی خدمت نہیں ہے (SERVICE) نہیں ہے بلکہ بدخدمتی (DISSERVICE) ہے۔

کسی اسلامی ملک کی جامعہ کا اولین فرض:

آپ مجھے معاف کریں میرا اشارہ کسی خاص جامعہ کی طرف اور کسی خاص جامعہ کے ذمہ داران کی طرف نہیں ہے۔ میں بالکل اصولی سی گفتگو کر رہا ہوں کہ ایک جامعہ جو کسی اسلامی ملک میں قائم ہو اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ان اقدار اور عقائد و خیالات پر اس تہذیب پر اس پیغام پر ان امتیازات و تشخصات پر یقین پیدا کرے جس کی وہ قوم حامل ہے اور وہ یقین محض عامیانہ یقین نہ ہو۔ ایک اسے لے مین (LAY MAN) کا یقین نہ ہو۔ ایک راستہ چلنے والے آدمی (MAN OF STREET) کا یقین نہ ہو بلکہ ایک پڑھے لکھے انسان کا ایک اسکالر کا یقین ہو جس کا دل جتنا مطمئن ہے اسی درجہ اس کا دماغ بھی مطمئن ہو۔ یہ نہیں کہ

"قلب او مومن دماغش کافر است"

جیسا کہ اقبال نے ایک مغربی فلسفی کے متعلق کہا۔ جس طرح فرد اور جماعت کے درمیان کشمکش جائز نہیں اسی طرح فرد کی زندگی میں فرد کے قلب و دماغ کے درمیان بھی کشمکش درست نہیں اور نہ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ کشمکش اگر کوئی جامعہ یا جامعہ کا نصاب کا کوئی طریق کار اور نظام پیدا کرتا ہے تو یہ کشمکش اس ملک کے لئے خوش قسمتی نہیں بلکہ بدقسمتی ہے۔

قلب اور دماغ دونوں کا اطمینان ضروری ہے:

آپ نے مجھے موضوع دیا ہے کہ اسلامی جامعات کا مقصد و منہاج کیا ہونا چاہئے؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا مقصد و منہاج یہ ہے کہ وہ ان چیزوں پر یقین پیدا کرے۔ وہ یقین جو علم اور مطالعہ کے راستہ سے ہوتا ہے، وجدان کے راستہ سے ہوتا ہے، دماغ کے سکون کے راستہ سے ہوتا ہے، تقابلی مطالعہ کے راستے ہوتا ہے۔ اگر یہ یقین کسی شخص کو قلبی طور پر حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس کا دماغ اس سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ اپنے دماغ کو بہلاتا رہتا ہے، پھسلاتا رہتا ہے، وہ اپنے دماغ کو بیدار نہیں ہونے دیتا۔ جس طرح بعض غیر مسلم ملتوں کا حال ہے کہ وہ اپنے مذہب کی بقا اور اپنے مذہب کی ترقی اس میں سمجھتی ہے کہ علم کا شعور جاگنے نہ پائے۔ وہ اپنے شعور کی زندگی و بیداری میں اپنے مذہب کی موت سمجھتے ہیں، اس لئے کلیسا اور علم (CHURCH اور SCIENCE) میں وہ کشمکش پیش آئی، جس کی خونریز کہانی اور دلدوز کہانی (CONFLICT BETWEEN RELIGIONS AND SCIENCE) ڈریپر کی مشکل کتاب میں آپ پڑھتے ہیں۔ یہ کشمکش اس لئے پیدا ہوئی کہ کلیسا کی بنیاد اس پر تھی کہ انسانی شعور جتنا سوتا رہے اچھا ہے۔ اسے لوریاں دے کر اور سلانا چاہئے اور انسان کا علم جتنا سوتا رہے اچھا ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ علم سے بالکل عاری اور محروم ہو۔ اس وقت تک مسیحیت کی زندگی ہے اسی وقت تک بائبل پر ایمان راسخ ہوگا۔ عہد عتیق کی کتابیں بعض ایسی باتیں پیش کرتی ہیں جن کی علم جدید تصدیق نہیں کرتا بلکہ اس کی نفی کرتا ہے اس لئے کلیسا اپنی خیریت اسی میں سمجھتا ہے کہ مسیحی شعور بیدار نہ ہونے پائے اور علوم ترقی نہ کریں۔ اس لئے وہ علم کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا علم کے لئے وہ سنگ راہ ثابت ہوا بلکہ اہل کلیسا نے علم کو اپنا مد مقابل اور حریف سمجھ لیا نتیجہ یہ نکلا کہ علم تو انسان کی فطرت کا ایک تقاضا تھا، علم تو انسان کے اندر کا ایک جذبہ تھا، علم تو خدا کی ایک نعمت تھی، علم تو دنیا کی ایک ضرورت تھی، علم تو خدا نے پھلنے پھولنے

اور بڑھنے کے لئے پیدا کیا تھا، مٹنے اور دب جانے کے لئے پیدا نہیں کیا تھا۔ صداقتیں مٹ نہیں سکتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو علوم کے مقابلہ میں اور لوگوں کے طلب علم اور شوق جستجو (CURIOCITY) کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یہ وہ منحوس واقعہ تھا جو اگرچہ مسیحی یورپ میں پیش آیا لیکن اس کا اثر تقریباً تمام دنیا اور تمام مذاہب پر پڑا اور لوگوں کی اکثریت نے اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ علم و عقل اور علم و مذہب کی ترقی ساتھ نہیں چل سکتی۔ تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ تھوڑے وقفے کے لئے بعض اسلامی ملکوں میں بھی یہ غلط خیال پیدا ہوا، لیکن اسلام چونکہ اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام کی روح اس کی منکر اور اس سے باغی ہے، اس لئے یہ چیز زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکی اور یہ مصنوعی کشمکش عالم اسلام میں قائم نہ رہ سکی۔ مسیحی یورپ کے اثر سے پیدا تو ہوئی لیکن بہت جلد مغربی ممالک کا یہ سایہ دُور ہوگیا۔

علم کی قسمت قلم سے وابستہ ؛

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی یونیورسٹیوں اور ان اسلامی جامعات کا ایک فرض تو یہ ہے کہ علم و دین میں یہ خلیج پیدا نہ ہونے پائے جو مسیحی یورپ میں یا ان مذاہب میں جن کا علم و عقل کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا بلکہ وہ علم و عقل سے بچ کر اور کترا کر بلکہ اس کی آنکھوں میں دھول ڈال کر پیدا ہوئے، اور اسی حالت با وہ پھلے پھولے وہاں تو اس بات کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن جس نے سب سے پہلے اپنے دین کا اور اپنی دعوت کا اور اپنے علم کا اعلان اس طرح کیا کہ

اقرأ باسم ربك الذي خلق
خلق الانسان من علق اقرأ
وربك الاكرم الذي علم
بالقلم علم الانسان ما لم يعلم٥

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

جس نے اپنی وحی کی پہلی قسط میں اور اس بارانِ رحمت کے پہلے چھینٹے میں بھی اس قلم کو، اس حقیر قلم کو فراموش نہیں کیا جس نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ علم کی قیمت قلم سے وابستہ ہے۔ غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبیٔ اُمّی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود نہیں سیکھا تھا جو قلم کے فن سے واقف نہیں تھا۔ آپ خیال کیجئے کیا دنیا میں دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی [illegible] اس بلندی کا تصور ہو سکتا ہے کہ نبیٔ اُمّی پر ایک امت اُمّی کے درمیان ایک ایسے ملک کے درمیان کہ جہاں علم کا ہنر عام نہیں تھا۔ جامعات اور دانشگاہیں درسگاہیں تو بڑی چیز ہیں جہاں حرف شناسی بھی نہیں تھی وہاں کسی نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے اور آسمان زمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوا، اس کی ابتداء "اعبد" سے نہیں، اس کی ابتدا "صلّ" سے نہیں بلکہ اس کی ابتدا ہوتی ہے "اقرأ" سے جو خود پڑھا ہوا نہ تھا اس پر جو وحی نازل ہوتی ہے اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ "اقرأ" اس لئے کہ تمہیں جو امت دی جانے والی ہے وہ امت صرف علم کی سچی طالب نہ ہوگی بلکہ وہ علم آموز ہوگی۔ وہ علم کو اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی۔ جو دور تمہیں دیا جاتا ہے اصلاح اور ہدایت کا جو دور تمہارے حصے میں آیا ہے وہ دور امیت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا۔ وہ دور جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور تخریب کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا۔ حکمت کا دور ہوگا۔ تعمیر کا دور ہوگا۔ انسان دوستی کا دور ہوگا۔ وہ دور ترقی کا دور ہوگا۔ اس لئے پہلی بار دنیا میں مذاہب کی تاریخ میں پہلا تجربہ تھا (اگر اس کو تجربہ کہنا صحیح ہو) کہ اس نبیٔ اُمّی پر ایک اُمّی قوم کے درمیان جو وحی نازل ہو رہی ہے اس کی ابتدا ہوتی ہے "اقرأ" (پڑھ) باسم ربك الذي خلق۔ بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستے سے ہٹ گیا تھا، اس لئے اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو یہاں جوڑا گیا۔ جب علم کو یاد کیا گیا، علم کو یہ عزت بخشی گئی، تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی متنبہ کیا گیا کہ اس علم کی ابتداء اسم رب سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ یہ علم اسی کا دیا ہوا ہے، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسی کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے۔ یہ جو جملے میں سنا رہا ہوں یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں انقلاب انگیز اور صاعقہ آسا آواز ہے جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی، جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو یہ دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے اور یہ بتائیے کہ یہ جو وحی نازل ہونے والی ہے اس کی ابتدا کس چیز سے ہوگی؟! اس میں کس چیز کو اولیت دی جائے گی؟! تو میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی بھی جو اس اُمّی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا، وہ سب کچھ کہہ سکتا تھا، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو پہلی وحی نازل ہوگی وہ "اقرأ" کے لفظ سے شروع ہوگی: "پڑھو ... اقرأ" قرأت کا لفظ ہے یہاں خالص علم کا بھی لفظ نہیں ہے۔ یعنی اس کا تعلق کاغذ سے بھی ہے۔ اس کا تعلق نقوش سے بھی ہے، اور اس کا تعلق قلم سے بھی ہے وہ علم نہیں جو لدنی طریقہ پر آتا ہے بلکہ وہ علم جو قلم کے ساتھ ہے کاغذ کے ساتھ ہے صحیفوں کے ساتھ ہے، کتب خانوں کے ساتھ ہے، تحریروں کے ساتھ [illegible]

کے ساتھ ہے۔ "اقرأ باسم ربک الذی خلق"

یہ دین علم سے الگ نہیں ہو سکتا

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دین کا مزاج بنا دیا گیا ہے کہ یہ دین کبھی علم سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ سب سے پہلے جو پیغام دیا گیا اس میں خود کہا گیا کہ "پڑھو" تو مسلمان بے پڑھے کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ مسلمان حقیقی مسلمان نہیں جو علم سے اپنا رشتہ توڑ لے وہ اسلام کا صحیح نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پہلی بات تو یہ انقلاب انگیز دعوت کہ "اقرأ"۔ پڑھو باسم ربک الذی خلق اپنے رب کے نام سے پڑھو، اس کی راہنمائی میں یہ سفر شروع کرو، اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل ہے بہت پر پیچ ہے۔ پر خطر ہے، قدم قدم پر قافلے لوٹنے والے ہیں۔ قدم قدم پر بڑی بڑی کھائیاں ہیں۔ قدم قدم پر گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سمندر ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں اس لئے اس میں ایک رہبر کامل رفاقت ہونی چاہئے اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے اس لئے اقرأ باسم ربک الذی خلق پڑھو۔ لیکن وہ مجرد علم نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے۔ وہ علم نہیں جو محض کھلونوں کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدہ کے رقبہ کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے۔ اقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربک الاکرم الذی بالقلم علم الانسان مالم یعلم۔ پڑھو تمہارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمہاری ضرورتوں سے تمہاری کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہو سکتا ہے۔ اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم

آپ خیال کیجئے قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غار حرا کی پہلی وحی نے بھی وہ قلم جو شاید ڈھونڈنے سے بھی مکہ میں کسی گھر میں نہ ملتا مجھے اس میں شک ہے کہ وہ قلم اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو معلوم نہیں کس ورقہ بن نوفل کے گھر میں ملتا یا فلاں کاتب کے یہاں جو عجم سے کوئی چیز سیکھ کر آیا ہو اس کے گھر میں ملتا اور وہ قلم جس کا استعمال عربی شاعری میں بھی بہت کم ہے۔ آپ اگر عرب شعراء کے دیوان پڑھیں۔ پڑھتے ہی چلے جائیں تو اس میں قلم کا نام آپ بہت ہی کم پائیں گے۔

سب کا خلاصہ

علم الانسان مالم یعلم

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ علم الانسان مالم یعلم "سائنس کیا ہے؟ علم الانسان مالم یعلم" ٹیکنالوجی کیا ہے؟ علم الانسان مالم یعلم" انسان چاند پر جا رہا ہے۔ یہ کیوں؟ علم الانسان مالم یعلم "یہ جو خلاء کو ہم نے طے کر لیا ہے اور ہم نے دنیا کی وسعتیں سمیٹ لی ہیں، اور دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں، اور سورج کی شعاؤں کو بقول اقبال گرفتار کر لیا ہے اور ستاروں کے درمیان اپنی راہگذر پیدا کی ہے، کیا ہے؟ علم الانسان مالم یعلم۔ علم اشیاء کی جہانگیری۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ جس امت کی اور جس پیغام کی بنیاد قرأت سے پڑی، فن قرأت سے پڑی اور قلم کے ذکر سے پڑی اس ملت کا اس قوم کا اس امت کا ساتھ کبھی قلم سے نہیں چھوٹ سکتا۔ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اب اس امت کے لئے جو دانشگاہ تعمیر کی جائے، جو نظام تعلیم مرتب کیا جائے، اس میں جو بنیادی چیز ہو۔ جو اصل کارفرما اور رہنما اصول ہے وہ یہ ہے کہ یہ علم یہ نظام تعلیم ان اقدار پر ان حقائق پر اور ان عقائد پر ایمان کو راسخ کر دے اور یہ پختگی صرف دل کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی ہو یعنی دل و دماغ دونوں سے مطمئن ہونے چاہئیں۔ اگر دل و دماغ دونوں مطمئن نہیں ہیں تو فرد کی زندگی میں کشمکش پیدا ہوگی اور یہ کشمکش پھر وسیع ہوتی جائے گی۔ پہلے وہ اپنے اندر ایک دوسرے سے دست گریبان پھر جماعت سے دست گریبان ہوگا۔ نئی نسل اپنے معاشرہ سے دست بگریبان ہوگی، اپنے دین سے دست بگریبان ہوگی اور بہترین توانائیاں اس نسل کی اس ملبے کو مٹانے میں اس کھنڈر کو دور کرنے میں صرف ہوں گی۔ پہلے اس ملبہ کو ہٹاؤ، پھر اس کے بعد تعمیر کرو اور تمام توانائیاں اس پر صرف ہو جائیں گی۔ ہمارے بعض مسلم قوموں کے سربراہوں نے اس طریقہ پر کام کرنا شروع کیا کہ پہلے ماضی کا ملبہ اٹھائیں، پہلے حقائق و عقائد کا ملبہ ہٹائیں پھر اپنی دعوت پیش کریں۔ اس میں ان کی عمر بیت گئی، اور ان کو جو وقت دیا گیا تھا کام کرنے کا وہ ختم ہو گیا اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تو جامعات کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان عقائد اور حقائق پر یقین کو استوار کریں اور صرف قلب کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی کہ ایک طرف دل ان کا حلقہ بگوش ہو اور ان کو اپنی تہہ میں گہرائی میں جگہ دے تو دوسری طرف دماغ کا کام یہ ہو کہ وہ ان کے لئے دلائل فراہم کرے اور وہ بھی اس طرح سے مطمئن ہو جس طرح دل مطمئن ہو۔ اس لئے اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھتا ہوں خاص طور سے مسلمانوں کے سلسلہ میں کہ وہ ان حقائق پر ان اقدار پر اس نسل کا اس تعلیم یافتہ نسل کا، ان اسکالرز کا ان یونیورسٹی گریجویٹس کا، فلاسفرس کا مفکرین کا یقین مضبوط کر دے اور ان کو اس قابل بنا دے کہ وہ دماغ سے ان کے لئے دلائل فراہم کریں۔ دنیا میں جو علمی ذخیرہ پرانا یا نیا پھیلا ہوا ہے وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں یا اپنے اس مقصد کی تکمیل میں استعمال کر سکے اور

استعمال کرنے کا سلیقہ رکھے۔ میرے نزدیک ایک جامعہ کی بہترین تعریف یہ ہے۔

سیرت سازی:

جامعات کا دوسرا کام سیرت سازی ہے۔ یونیورسٹی ایسا کیریکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبال ایک کفِ جو کے بدلے میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو۔ آجکل کے خلاف اسلام فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے۔ وہ اگر قیمت پر نہیں خریدا جاسکتا ہے تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا۔ ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ کیریکٹر بنائے، وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کرسکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت کوئی تخریبی فلسفہ کوئی غلط دعوت کوئی حکومت انکو کسی دام خرید نہ سکے اور جو یہ کہہ سکیں کہ ؎

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور اقبال نے کہا ہے کہ ؎

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں وقف کردیں، جو قربانی کے لئے تیار ہوں، جن کو کسی کے لئے بھوکے رہنے میں وہ لذت آئے جو پیٹ بھر کر کھانے اور ناؤ نوش (LIFE ENJOY) میں آتی ہے۔ جن کو کھونے میں وہ لذت آئے جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں آتی۔ جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں اور ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے ملت کی سربلندی کے لئے دین کی سربلندی کے لئے اپنے ملک کو بچانے کے لئے صرف کرے۔ ایک باعزت ملک، باعزت ملت، صاحب پیغام ملت بنانے میں صرف کرے۔ یہ دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ دل و دماغ کو وہ غذا دی جائے۔ وہ روشنی دی جائے کہ جس سے دل و دماغ دونوں مل کر باہمی تعاون (CO-OPERATION) کے ساتھ ایک دوسرے کی رفاقت کے ساتھ ان حقائق اور عقائد پر ایمان کو پختہ کریں اور دوسروں کو سمجھنے قائل ہونے کا موقع دیں اور انہیں مطمئن کریں۔

آپ یہ دیکھیں کہ آپ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہے ہیں۔ میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں کتنی یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہوگئی ہے، بلکہ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ علم کے شوق میں ریسرچ کی راہ میں اور علم کے پھیلانے کے جذبہ سے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں۔ اپنی قوم کو صاحب شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کے لئے کتنی تعداد میں وہ نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کرکے اس مقصد کے لئے اپنے کو وقف کرتے ہیں۔ اصل معیار یہ ہے اور یہی معیار ہونا چاہئے۔ کتنے نوجوان ایسے ہیں کہ جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کرکے کسی گوشہ میں ٹھوس علمی کام کر رہے ہیں۔ ملت کی سربلندی کے لئے یا کسی نظریہ کی دریافت کے لئے یا کسی علمی تحقیق کے لئے اور اپنے ملک کو طاقتور بنانے کے لئے۔

یہی دو حقیقی مقصد ہیں۔ باقی صرف پڑھنا لکھنا دینا اور ملازمت کے قابل بنا دینا میں سمجھتا ہوں اب کسی جامعہ کے لئے قابلِ تعریف نہیں۔ اور میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے وائس چانسلر اور جو اس جامعہ کی رہنمائی کرنے والے ہیں وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے کہ ہماری جامعہ کا مقصد صرف یہ رہ جائے کہ پڑھے لکھے نوجوان ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہو جائیں اور محکموں، کارخانوں اور دکانوں میں فٹ ہو جائیں اور پتہ نہ چلے کہ وہ کہاں گئے۔

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے:

اس جامعہ کا مقصد جو ایک ایسے نازک ملک میں ایسے نازک دور میں قائم ہوا ہے یہی ہونا چاہیئے کہ وہ اس انتشار کو رفع کرے جو تمام ممالکِ اسلامیہ میں تقریباً سو برس سے نمایاں ہے۔ جب مغربی تہذیب اور مغرب کی سیاسی یلغار شروع ہوئی تو اس وقت ہمارے عقائد اور حقائق کی بنیادیں ہل گئیں، اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہوئی کہ اس پر بہترین توانائیاں داعیانِ مذہب کی صرف ہو رہی ہیں اور یہ ایک ایسی غیر فطری صورتِ حال ہے کہ جس کو جلد ختم ہو جانا چاہیئے اب توانائیاں خالص تعمیری مقاصد اور ملک کی حفاظت اور ترقی پر صرف ہونی چاہئیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ادب، شاعری، فنونِ لطیفہ، حکمت، فلسفہ، تصنیف و تالیف سب کا مقصد یہ ہے کہ آپ میں زندگی، نیا یقین پیدا ہو اور آپ کے ذریعے سے ملت میں ایک نئی زندگی پیدا ہو۔

میں اس وقت شاعرِ اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کے شعر پڑھوں گا، جو انہوں نے اگرچہ کسی ادیب یا شاعر سے مخاطب ہو کر کہا لیکن یہ ہم پر پوری طرح صادق آتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

آج ملت اسلامیہ پاکستان کو ایک ضرب کی ضرورت ہے اس لئے کہ قوموں کی کشتی اس کے بغیر ساحل تک نہیں پہنچ سکتی۔ جن حالات سے ہم گذر رہے ہیں وہ ایک معجزے کے طالب ہیں یہ معجزہ اسلام کے ابدی پیغام میں مضمر ہے ؎

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

باقی صفحہ ۲۵ پر

ظہور الدین بٹ

انقلابی مسلمانوں کی جنگیں

سید احمد شہیدؒ کی فوج کا پہلا حملہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوا۔ اس مقابلہ میں ۳۷ مہاجر شہید اور ۳۵ زخمی ہوئے۔ اس حملہ کے نتیجہ میں مخالفین، مسلمانوں کی قوت، بہادری اور چابک دستی سے مرعوب ہو گئے اور قرب و جوار کے خوانین بھی متاثر ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد قلعہ "ہنڈ" کا رئیس "خادی خاں" بڑی عقیدت مندی سے حاضر ہوا۔ مجاہدین میں اپنا نام لکھوایا اور سید احمد شہیدؒ کے تمام رفقاء کو قلعہ میں لے گیا۔

اس کے بعد ہونے والی جھڑپوں میں اکثر و بیشتر کامیابیاں مہاجرین کو نصیب ہوتی رہیں۔ اسی طرح علاقے کے پٹھان بھی آپؒ کے حلقے میں شامل ہوتے رہے، حتیٰ کہ ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کو جب آپ نے اپنی باضابطہ امارت و حکومت کا اعلان کیا تو سوات، ستہ اور بنیر کے خوانین (بقول مولانا شاہ اسمٰعیل فوج و لشکر اور توپ و شاہین کے مالک تھے)، بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔

یار محمد خاں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا گورنر مقرر تھا، اس کے بھائی سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں نے بذریعہ خط سید احمد شہیدؒ کی امارت تسلیم کر لی تھی۔ سکھوں کی حکومت کی جانب سے سید احمد شہیدؒ کو پیش کش ہوئی کہ "دریائے اباسین سے اس پار کا علاقہ مہاراجہ کی طرف سے انعام تصور کریں اور آئندہ اقدام کا قصد نہ کریں۔ مگر آپ چونکہ ملک کے خواہاں تھے نہ حکومت و امارت کے متمنی، بلکہ جس اعلیٰ مقاصد کے لئے آپ اور آپ کے ساتھیوں نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں، ان کے لئے ایسے انعامات توہین کے مترادف تھے اس وجہ سے آپ نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مہاراجہ کی طرف سے باقاعدہ حملے کا بندوبست کیا گیا۔

سیدو کے مقام پر انقلابیوں کی سکھوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔ سکھوں کا لشکر جرار پورے ساز و سامان سے لیس وہاں پہنچا اور سید احمد شہیدؒ کے لشکر بھی میدانِ جنگ میں خیمہ زن ہو گئے۔ اس موقع پر آپ کے زیر حکم ایک لاکھ کا مجمع تھا، مگر اس قدر بھاری جمعیت کھوکھلی تھی، کیونکہ اس لشکر میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جن کے غرور اور بلند مرتبی کو سید احمد شہیدؒ کی حکومت کے محکمۂ احتساب کی مساوات پسندی سے ٹھیس پہنچی تھی۔

خادی خاں جس نے بڑی عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا، وہ بھی محکمۂ عدلیہ کے شکنجہ میں کسا جا چکا تھا۔ موضع مانیری کے جھگڑے میں خادی خاں کے   کے خلاف فریق ثانی کو ڈگری دی گئی تھی،   س کا اجراء بھی کر دیا گیا تھا۔

سردارانِ پشاور بھی سید احمد شہید کے لشکر میں شامل تھے جو آپ کی امارت قبول کرنے کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیر اثر تھے اور شاہ پرستانہ مزاج کے باعث ان کی ہمدردیاں رنجیت سنگھ کے لئے تھیں۔

اس اندرونی کمزوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ خاص اس شب جس صبح فیصلہ کن جنگ ہونے والی تھی، سید احمد شہیدؒ کو زہر دیا گیا۔ صبح مولانا اسمٰعیل آپ کے خیمہ میں گئے تو سید احمد شہیدؒ کی حالت غیر تھی۔ ان پر بے ہوشی کا غلبہ تھا۔ اور قے جاری تھی۔ مولانا اسمٰعیل نے اس خبر کو کمال ہوشیاری سے چھپائے رکھا۔ خود آپ نے بھی جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے مرض کو چھپائے رکھا اور اسی حالت میں ہاتھی پر سوار ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔

میدانِ جنگ میں مجاہدین کا پلہ بھاری تھا۔ اس دوران سردارانِ پشاور اور سکھوں کی فوج کے کمانڈر میں کچھ نامہ و پیام ہوا اور سردارانِ پشاور اپنی فوج اور سامانِ جنگ لے کر میدانِ جنگ سے نکل گئے۔ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ سردارانِ ستہ اور ان کی فوج

بددل ہوگئی۔ اس طرح لڑائی کا سارا دباؤ ہندوستانی مہاجرین انقلابیوں پر آن پڑا۔ وہ پوری ہمت و جوانمردی سے لڑے، مگر اس طرح سے گھر گئے کہ فتح کا امکان ختم ہوگیا۔

دریں اثناء دوسری سازش منکشف ہوئی کہ شاہ پرستوں (یار محمد خاں) کا پیش کردہ ہاتھی، جس پر سید احمد شہیدؒ سوار تھے، لنگڑا ہے۔ فوراً آپ کو گھوڑے پر سوار کرایا گیا اور مجاہدین کو گھیرے سے نکلنے کا حکم دیا گیا۔

سید احمد شہیدؒ کو ایک قریبی گاؤں میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک ہفتے کے آرام کے بعد آپ کو صحت نصیب ہوئی۔ اس جنگ میں اگرچہ مجاہدین کو شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ شاہ پرستوں کا مذہب کچھ بھی کیوں نہ ہو ان کا محاذ ایک ہی ہے۔ یار محمد خاں اور خادی خاں وہی کر سکتے ہیں جو شیر سنگھ اور بدھ سنگھ (کمانڈر) کے رجحانات ہیں۔

۱۸۲۹ء تک پشاور میں داخل ہوگیا۔ اہلِ شہر نے مجاہدین کا پُرجوش استقبال کیا۔ دوکانیں کھل گئیں۔ سید احمد شہید نے شہر میں امن کا اعلان کرا دیا جس سے شہری مطمئن ہوگئے۔ البتہ اب فحبہ خانے بند ہوگئے۔ شراب کی بھٹیاں سرد پڑ گئیں اور بازاری عورتیں روپوش ہوگئیں۔

اعمال و اخلاق پر احتساب جاری کیا گیا اور مقدمات کے فیصلوں کے لئے عدالت قائم کر دی گئی۔ یار محمد خاں کے بھائی سلطان محمد خان نے جب حالات کو تبدیل دیکھا تو وہ بااثر خوانین کی سفارش کے ساتھ طالبِ عفوِ تقصیر ہوا۔ سید احمد شہیدؒ کے چند ساتھیوں نے درخواست کی مخالفت کی، مگر اس کی درخواست قبول کر لی گئی اور اسے حاکم مقرر کر دیا گیا جبکہ مولانا سید مظہر علی عظیم آبادی کو محکمۂ انصاف کا جج مقرر کر دیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد مجاہدین کے لشکر نے پشاور سے نکل کر پنجتار

قائم ہو چکی تھی تو دوسری طرف شمال مشرق میں سید احمد شہیدؒ کے معتقد خاص نثار علی نے بنگال میں تحریک شروع کر کے ایک منظم بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی۔

سکھوں اور انگریزوں کے علاوہ سلطان محمد خاں جیسے حاکم پشاور بنا دیا گیا تھا، شاہ پرستی میں اپنے مقتول بھائی خادی خاں سے کسی طرح پیچھے نہ تھا۔ سید احمد شہیدؒ سے خوشامد سے حکومت حاصل کرنے کے بعد رنجیت سنگھ سے کامل وفاداری اور اطاعت ظاہر کرنے کے لئے لیلیٰ نام کی گھوڑی اور مروارید کی مالا اس کی نذر کی جو وفاداری اور خوشامد کی انتہا تھی۔

انگریزوں کی سرپرستی میں ان تمام سامراج دوست طاقتوں نے مجاہدین کے خلاف "وہابی"[1] کا لفظ نفرت پھیلانے کے لئے استعمال کیا جس نے انقلابی مسلمانوں کے خلاف جلتی پر تیل کا کام کیا۔ سرحدی پٹھانوں میں غیر اسلامی رسومات کے خلاف سید احمد شہیدؒ کی سرگرم اصلاحی جدوجہد اس الزام کی پھر ایک منظم سازش کے تحت تمام علاقے کو انقلابی مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا گیا۔

> سامراجیوں نے انگریز کی سرپرستی میں مجاہدین کے خلاف
> "وہابی" کا لفظ نفرت پھیلانے کے لئے استعمال کیا۔

دوبارہ لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سردارانِ پشاور جنگ میں پیش پیش تھے اور سکھ سردار اور ان کی فوج سردارانِ پشاور کی پشت پر۔ مگر ان متحدہ قوتوں کے مقابلہ میں بھی کامیابی و نصرت مجاہدین کے قدم چومتی رہی۔

انقلابی فوج نے ۱۱؍ اگست ۱۸۲۹ء کو قلعہ ہنڈ پر حملہ کیا۔ خادی خاں مارا گیا اور قلعہ مجاہدین کے قبضہ میں آگیا۔ خادی خاں کے بھائی امیر خان نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے یار محمد خان سے امداد چاہی۔ یار محمد خاں نے امیر خاں کی مدد کے لئے ہنڈ پر لشکر کشی کی۔ مجاہدین کے مقابلہ میں یار محمد خاں قتل ہوا۔ اس کی فوج نے راہِ فرار اختیار کی۔ بعد ازاں امیر خاں کا بھی انتقال ہوگیا۔

انقلابی لشکر آگے بڑھا اور اواخر ستمبر

کیمپ میں پڑاؤ ڈالا۔

پشاور کی فتح مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لئے ناقابلِ برداشت حادثہ تھی۔ انگریز جو ۱۷۹۹ء میں شاہ زمان کے عہد میں ایران اور کابل کی بساطِ سیاست میں شامل ہو چکے تھے۔ لارڈ منٹو ۱۸۰۸ء کے زمانے میں انگریزی سفارت مسٹر الفنسٹن کی رہنمائی میں کابل سے باضابطہ تعلق پیدا کر چکی تھی، ان کے لئے بھی یہ حادثہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہ تھا، کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اگر پڑوسی ہونے کے سبب انقلابی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھا تو انگریزوں کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ فاتح پشاور کے عقیدتمند پورے شمالی ہند اور بنگال میں موجود تھے۔ اگر شمال مغرب میں سید احمد شہیدؒ کی حکومت پشاور میں

مجاہدین کا قتل عام:

سلطان محمد خان نے حالات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے بھائی یار محمد خاں کے قتل کے الزام میں قاضی مظہر علی (محکمۂ انصاف کے جج) کو سرِ دربار قتل کر دیا۔ فیض اللہ مہمند جن کی کوششوں سے سلطان محمد خاں کو معافی اور پشاور کی حکومت ملی تھی، نے جب قاضی

---

[1] شیخ عبدالوہاب نجدیؒ کے پیروکاروں کو وہابی کہا جاتا تھا۔

عظیم ہستیاں

اسد فیض چوہدری

جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی

سفیرِ رسولؐ، جامعِ قرآن

کاملُ الحیا والایمان

امیر المومنین

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

دامادِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم

ذوالنورین

کاتبِ وحی

مہاجرِ اولؐ

صحابیِ رسولؐ

"جو خدا کی راہ میں شہید ہو گئے
ان کو مُردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں
تمہیں اس کا احساس نہیں۔"

(سورۃ البقرہ)

ذوالحجہ کا مہینہ تھا۔ حج کو گذرے ابھی تین دن ہوئے تھے۔ جمعہ کا روز تھا مسلمانوں کے خلیفہ سوم کے محل کے اردگرد دشمنوں نے محاصرہ کر رکھا تھا جو غلط قسم کے الزامات لگاکر خلیفہ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ اور خلیفہ وہ مشہور صحابی تھے جن کی شہادت کے بارے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ نے ایک مرتبہ بیان فرمایا تھا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ پر چڑھے تو پہاڑ ہلنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ کو ٹھوکر مار کر فرمایا:

"اے احد! ٹھہر جا تیری پشت پر اس وقت ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک صدیق اور ایک شہید ہے۔"

دشمنوں کا زور گھر کے اردگرد بڑھتا جا رہا تھا۔ گھر کے اندر صحابہ کرامؓ اور مسلمانوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ لیکن مسلمانوں کے خلیفہ سوم نے یہ کہہ کر صحابہ کرامؓ اور مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دی کہ "صرف میری ذات کے لئے مسلمانوں کا خون نہ بہایا جائے۔" آپؓ نے خود بھی گھر کی چھت سے باغیوں کو سرزنش کی۔

"اگر آج تم نے مجھے قتل کر دیا
تو قیامت تک نہ اکٹھے نماز پڑھ
سکو گے اور نہ جہاد کر سکو گے۔"

لیکن دشمنوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ جمعہ کا روز تھا۔ آپؓ روزے سے تھے عصر کے وقت کچھ لوگ چوری سے پیچھے کی طرف سے چھت سے گزر کر آپ کے پاس پہنچے اور دشمنوں نے مسلمانوں کے خلیفہ سوم کو قرآن پاک پڑھتے ہوئے شہید کر دیا۔ خلیفہ سوم کی لاش مبارک ایک دن بے گور و کفن پڑی رہی۔

کابل سے لے کر مراکش تک اسلامی سلطنت کے تیسرے مسلمان فرمانروا کو صرف سترہ آدمیوں کی مختصر جماعت نے سپردِ خاک کیا۔

مسلمانوں کے یہ تیسرے خلیفہ جنہیں انتہائی مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا، حضرت عثمانؓ تھے۔

آپؓ کا اسم مبارک عثمان، کنیت ابوعبداللہ اور لقب ذوالنورین تھا۔ والد کا نام عفان تھا اور والدہ کا نام اروٰی تھا۔ چونکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں سے آپؓ نے یکے بعد دیگرے نکاح کیا، اس لئے لقب ذوالنورین یعنی دو نوروں والا پایا۔ آپؓ قریش کی مشہور شاخ [illegible] سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچویں پشت پر آپ کا نسب [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] حضرت عثمانؓ [illegible] سال [illegible] تجارت تھا۔ اس میں [illegible] اتنی ترقی کی کہ دولت مندوں میں شمار ہونے لگے۔ دولت و ثروت کی وجہ سے غنی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آپؓ عمر کے چونتیسویں سال میں تھے جب اسلام کا ظہور ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آپؓ کے خاصے گہرے مراسم تھے۔ صدیق اکبرؓ کی

تبلیغ نے انہیں اسلام کی طرف مائل کیا۔ آپؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی بیٹی رقیہؓ کا عقد آپؓ سے کیا۔

حضرت عثمان اوّلین مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپؓ کا خاندان ان دنوں اسلام کا سخت دشمن تھا۔ آپؓ دینِ حق کے حلقہ بگوش ہوئے تو اعزہ نے آپؓ کو کڑی سزائیں دیں، لیکن آپؓ کی ثابت قدمی میں فرق نہ آیا۔ کچھ عرصے تک حضرت عثمانؓ بنو امیہ کے مظالم برداشت کرتے رہے۔ جب ہجرت کی اجازت ملی تو اپنی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو لے کر حبشہ کی طرف کوچ کیا۔ اس نسبت سے حضرت عثمانؓ مہاجر اوّل کہلاتے۔

آپؓ بڑے کشادہ دل اور فیاض تھے۔ مالی جہاد میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ آپؓ کی دولت سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ مدینہ شریف میں میٹھے پانی کا صرف ایک کنواں تھا۔ یہ کنواں ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کی یہ تکلیف دیکھی تو بیس درہم دے کر یہ کنواں خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ مسجد نبویؐ میں توسیع کی ضرورت ہوئی تو آپؓ نے پچیس ہزار درہم کے لگ بھگ رقم سے جگہ خرید کر دی۔ خانہ کعبہ کی توسیع کے لئے قریباً دس ہزار درہم میں زمین خریدی۔ مدینہ آنے کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگ بدر میں حضرت رقیہؓ کی علالت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا تھا اور فرمایا تھا کہ تم کو جنگ میں شرکت کا ثواب اور مالِ غنیمت دونوں ملیں گے۔

آپؓ ان دس صحابہؓ میں سے تھے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام بنام جنت کی بشارت دی تھی۔ یہ اصحاب عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ ایک مالدار شخص تھے۔ جو کچھ کماتے غریبوں میں بانٹ دیتے۔ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے۔ کبھی زائد رقم اپنے پر خرچ نہ کرتے۔ فرش پر سوتے تھے۔ جب سو کر اٹھتے تھے تو جسم مبارک پر کنکروں کے نشان ہوتے تھے۔ آپؓ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد خلیفہ بنے۔ آپؓ کے خلافت کے دَور میں اسلامی سلطنت دُور دُور تک پھیل گئی۔

آپؓ کے دورِ خلافت میں ایک بڑا کارنامہ قرآن پاک کی نئے سرے سے ترتیب اور ایک ہی قرآن پاک کی کاپیاں تیار کروا کر دور دراز کے علاقوں میں بھیجنا ہے۔ اس سے مسلمان اختلافات سے بچ گئے۔ آپؓ نے حکم دیا کہ قرآن مجید کو قریشی لب و لہجے میں پڑھا جائے۔ آپؓ کے زمانے میں (بقول مورخ طبری) سلطنت اسلامی کابل سے مراکش تک پھیل گئی، اور اس طرح اپنے پیشرو خلفاء کی دی ہوئی حدود میں اضافہ کیا، اور ان تمام ممالک میں اسلام کی تبلیغ کا کام کر کے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”فرشتے بھی عثمان غنیؓ سے حیا کرتے ہیں“

حضرت عثمان غنیؓ اپنی سیرت و اخلاق کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپؓ نہایت رحمدل، خوش اخلاق اور خدا ترس انسان تھے۔ حیا داری میں اتنے نمایاں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتے بھی عثمان غنیؓ سے حیا کرتے ہیں۔

عثمانی عہد کے ابتدائی دو سال بہت آرام و سکون کے ساتھ گذرے۔ اس عرصے میں فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا۔ خراج کی آمدنی بڑھ گئی اور مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا اور ملکی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ لوگوں کی معاشرتی حالت سدھر گئی۔ لیکن اس کے بعد کے سالوں میں ایسے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے جن کے باعث خلیفہ سوم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

اس دور میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں ایک عجیب تبدیلی آئی۔ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا کی جگہ دنیا کی محبت و دولت نے جگہ لے لی۔ قناعت کی بجائے حُبِ دنیا اور تن آسانی نے لوگوں کے ذہنوں میں گھر کر لیا۔ لوگوں کی توجہ بیرونی معاملات سے ہٹ کر ملکی مسائل کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

ذاتی اغراض کو لوگ قومی مفادات پر ترجیح دینے لگے تھے۔ ملک میں ایسی جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں، جو خلیفہ کے کاموں میں مدد کی بجائے معترض ہونے لگیں۔

آخر کار یہ حالات اسقدر تشویشناک صورت اختیار کر گئے کہ خلیفہ کو اپنی ہی رعایا کے ہاتھوں شہید ہونا پڑا۔ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد اسلامی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اسلامی تاریخ کے واقعات میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں سے امت کے درمیان اختلاف و افتراق کا بیج پڑ جاتا ہے۔ اسلامی فتوحات رک جاتی ہیں اور اشاعتِ اسلام کا کام بند ہو جاتا ہے۔

اسی شہادت کا یہ نتیجہ نکلا کہ خلافتِ راشدہ کے چوتھے حکمران حضرت علیؓ کو اپنے پورے زمانہ میں بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ انہیں بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے خون سے آغاز ہوا اور ہزاروں مسلمانوں کا خون بہہ کر بھی اس کا اختتام نہ ہوا۔

(باقی بر صفحہ ۲۰ پر)

۴۔ پریس:

مولانا ولایت علی نے مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی سے مولانا شاہ عبد القادرؒ کا ترجمہ قرآن اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے تصنیف کردہ رسالے جمع کئے اور دو [illegible] کے دوران اپنے ایک مرید مولانا مد [illegible] کی [illegible] سر دوانی کے ذریعے ان کی طا [illegible] سبت کیا۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر [illegible] ہے کہ:

انگریزوں کے خلاف [illegible] پر اگر وہابیوں کی نظم و نثر [illegible] مختصر کیفیت بھی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال کی پیشن گوئیوں سے پُر اور ضرورت جہاد کے لئے وقف ہے بعض کتابیں تو ان میں حد سے زیادہ اشتعال انگیز ہیں۔ اور مسودات کی صورت میں رازداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کی اشاعت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ان کا زہریلا پن ان کے پڑھنے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مبلغین کے اس گروہ کے ساتھ ساتھ جن میں تبلیغ دین کی مہم پر جانے سے پہلے باغیانہ روح پھونک دی جاتی ہے بنگال کے ہر ضلع تک پہنچتا ہے۔"

تقسیم کار اور تنظیمی سرگرمیاں:

جماعت کے مختلف ارکان کے ذمے مختلف کام اور علاقے سونپ دیئے گئے۔ مولانا ولایت علی جو انقلابیوں کی جماعت کے امیر تھے اور عام طور پر جنہیں "بڑے حضرت" کہا جاتا تھا تحریک کے عمومی نگران مقرر ہوئے۔ بیرونی ممالک سے رابطہ قائم کرنا آپ کے فرائض میں داخل تھا۔

نیز پٹنہ میں قیام کے دوران نواب فخر الدولہ کی مسجد میں نماز جمعہ اور نماز کے بعد تقریر آپ کے ذمہ تھی۔ باقی دنوں میں تقاریر اور درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پارٹی کے خاص ارکان کے علاوہ تحریک کے ہمنواؤں میں تبلیغ کا سلیقہ پیدا کر کے انہیں قصبوں اور دیہی علاقے کے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا جاتا تھا۔

مولانا محمد علی رامپوری: آپ کو حسب سابق جنوبی ہند کے علاقے [illegible] [illegible] تھا۔

شاہ محمد حسین کو صوبہ بہار سپرد کیا گیا۔ انہوں نے وطن عزیز کو چھوڑ کر بنگال میں قیام فرمایا اور وہاں کئی برس گزار دیئے۔ ان کی جدوجہد اور جذبہ جہاد کے متعلق ولیم ولسن ہنٹر کہتا ہے کہ:

"پٹنہ کے خلفاء جوان تھک واعظ، خود اپنے آپ سے بے پرواہ [illegible] کرنے والے، انگریز [illegible] کو تباہ کرنے میں مصروف [illegible] روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لئے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور ان کے لئے ایک مثال تھے۔ ان کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی، اور یہ انہی کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصوّر پیدا کرنے کی ترغیب دی۔"

وقت گذرنے کے ساتھ مجاہدین کا طریق کار انقلابی ہوتا گیا۔ انہوں نے پٹنہ کے دار الاشاعت کو انقلابیوں اور حریت پسندوں کے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ اس کے ارد گرد دیواروں اور حجروں کی بھول بھلیاں بنائی گئیں جو خفیہ دروازوں کے ذریعے ایک دوسرے میں ملی ہوئی تھیں۔ غیر مشتبہ مقامات پر چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر کئے گئے جہاں پر انقلابی رازداری کے ساتھ مشورہ کرتے۔ پہلے خلفا نے تو مجسٹریٹ کے وارنٹ گرفتاری کے خلاف مسلح مدافعت کی دھمکی دی تھی، مگر ان کے جانشینوں نے [illegible] کے لئے کم خطرناک پیچدار راستوں [illegible] حتٰی کہ جب حکومت کو انقلابیوں کے خلاف کارروائی کے لئے اس عمارت کا نقشہ حاصل کرنا پڑا۔

ہر ضلع کے مبلغین، ان لوگوں کے گروہ [illegible] دار الاشاعت میں بھیجتے۔ ان میں سے اکثر کو [illegible] بیڑا اور بھڑکا دیتے، چھوٹے چھوٹے [illegible] شکل میں سرحدی کیمپ کی طرف [illegible] دیا جاتا۔ ان میں سے زیادہ ہوشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لئے منتخب کر لیا جاتا تھا اور جب وہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو پھر ان کو ان کے صوبے کی طرف ایک واعظ یا مذہبی کتب فروش کی حیثیت سے واپس کر دیا جاتا۔

اس دوران خود مولانا ولایت علی اور مولانا محمد علی نے جنوبی ہند اور بنگال کا دورہ کیا اور مدبرانہ تنظیم کے ذریعے مبلغین کو اس قابل بنا دیا کہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے وہ اپنا مرکز قائم کر لیتے۔ ایسے مبلغین وقتاً فوقتاً دورے کرتے اور تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو تحریک کی طرف راغب کرتے۔

انقلابیوں کی تحریک جنوبی ہند میں اسقدر کامیاب ہوئی کہ عورتوں نے اپنے ہیرے جواہرات تک بیت المال میں جمع کرا دیئے۔ شمال مغربی صوبوں سے رنگروٹوں کی کمپنیوں کی کمپنیاں مجاہدین کے کیمپ کی جانب روانہ ہوئیں اور ہر جگہ پر مبلغین نے عوام کے جوش کو انتہا پر پہنچا دیا۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ

"ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر ایک گاؤں میں خود حکومت کے افسران کی زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی، مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا اور فتنہ و فساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا۔"

حریت پسندوں کی ایک انقلابی جماعت جو مشرقی اضلاع میں بہت مؤثر تھی اور فرائضی کے نام سے مشہور تھی [illegible] علی عرف ٹیٹو میاں [illegible] میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ [illegible] جی نے ان کو بھی انقلابیوں کی تنظیم میں شامل کرلیا تھا جس سے ۲۶ میں اس جماعت کے ارکان کی تعداد اسی ہزار تک پہنچ گئی۔ اس تنظیم کے [illegible] آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے [illegible] سرگرمی سے جماعت کے [illegible] تھے۔ ان کی شجاعت [illegible] کرتے ہوئے ولیم ولسن ہنٹر [illegible] "ہندوستانی مسلمان" کے صفحہ ۱۴۵ پر لکھتا ہے کہ:

مجاہدین کو حقارت سے دیکھنا ایک غلطی ہے

ولیم ولسن ہنٹر

"درہ امبیلہ کی لڑائی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ ان اشخاص کو بے پروائی اور حقارت کی نظر سے دیکھنا ایک غلطی ہے۔ مزید یہ کہ بعض حالات کے تحت ایک بنگالی بھی اسی بے جگری سے لڑ سکتا ہے جس طرح ایک افغانی۔"

اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۶ پر وہ لکھتا ہے کہ:

"یہ شرانگیزی یہاں تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لئے اس بات کو معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہوگیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے۔ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے اور ان کے خلاف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو ان کے مرید ہوں لیکن ان

کا حال یہ ہے کہ اپنے سردار سے غداری کی بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

ایک اور جگہ پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"گویہ مقامی مبلغین بعض دفعہ خطرناک آتشیں بیان ثابت ہوتے ہیں مگر میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں۔ ان میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی شروع کرتے ہیں۔"

مولانا ولایت علی نے جب محسوس کیا کہ اب عظیم آباد پٹنہ میں تحریک کی مرکزیت مضبوط ہوچکی ہے تو آپ بنگال تشریف لے گئے جہاں آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی دو سال سے کام کر رہے تھے۔

بنگال میں شہروں اور دیہات کا دورہ کرتے ہوئے آپ کلکتہ پہنچے، وہاں سے بمبئی اور بمبئی سے حجاز تشریف لے گئے۔ بمبئی میں قیام کے دوران آپ نے مولانا عنایت علی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور مع اہل و عیال مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

[illegible] سے واپسی پر آپ مولانا عنایت علی کو ساتھ سے ہمراہ لے کر کلکتہ پہنچے اور بنگال کا دورہ کرتے ہوئے تحریک کے مرکز صادق پور پٹنہ میں فروکش ہوئے اور جماعت کی مرکزی لیڈرشپ میں مولانا زین العابدین حیدرآبادی اور مولانا محمد عباس کو جو کسی طرح حیدرآباد سے فرار ہوکر اپنے ساتھیوں سمیت پٹنہ پہنچے تھے شریک کرلیا اور تنظیم کے لئے اڑیسہ اور الہ آباد کا علاقہ ان کے سپرد کیا۔

ابتدائی منازل طے ہوچکی تھیں اور حریت پسندوں کی نگاہیں آزاد سرحد کی جانب اٹھ رہی تھیں کہ سید ضامن شاہ کی درخواست پہنچی جس میں گلاب سنگھ (کشمیر کا راجہ) کے خلاف مدد کے لئے کہا گیا تھا۔ ان کی مدد کے لئے مولانا عنایت علی کو بھیجا گیا۔ بعد ازاں خود مولانا ولایت علی بھی بالاکوٹ پہنچے اور انقلابیوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

(جاری ہے)

بقیہ حضرت عثمان غنیؓ

ایک ایسے عادل۔ صحابی رسول خلیفہ کو تاریخ کے اوراق ہمیشہ [illegible] رہیں گے جس نے لوگوں کے ساتھ بھلائی کی [illegible] میں انہیں شہید کردیا گیا۔

یہ ہی وہ عظیم ہستیاں [illegible] کی بدولت اسلام کا شجر پھلا پھولا [illegible] کے حالات پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ ان عظیم ہستیوں نے خدا کے دین کی خاطر کتنی قربانیاں دیں، کس قدر صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

صاحب کے قتل پر احتجاج کیا تو وہ بھی قتل کر دیئے گئے۔ دریں اثناء سید احمد شہیدؒ کی حکومت کے سینکڑوں کارکنوں کو جو عشر کی وصولی کے لئے علاقہ سمہ میں متعین کئے گئے تھے ایک ہی شب میں ذبح کر [illegible] کی تعداد چار ہزار [illegible]

حالات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ پشاور اور سمہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی اور ملوکیت کے پرستاروں کا قلع قمع کیا جاتا۔ مگر فرسودہ نظام کو تبدیل کرنے کا عہد کرنے والے عظیم انقلابی "سید احمد شہیدؒ" نے خانہ جنگی کو پسند نہ کیا۔ سید صاحب کا ارادہ سندھ کو مرکز بنانے کا تھا مگر آپ نے سندھ پر بالاکوٹ کو ترجیح دی اور پشاور سے تقریبًا سولہ ماہ بعد اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد چار سال اور چار ماہ بعد ۱۸۳۰ء میں آپ نے اس علاقے سے کوچ کیا۔

برف باری کا موسم ہونے کے سبب مجاہدین کی جماعت آگے بڑھنے سے قاصر رہی۔ ایک محفوظ میدان میں مجبوراً پڑیاں ڈال دی گئیں۔ اس میدان سے چند میل کے فاصلے پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ولی عہد شیر سنگھ کی فوجیں بھی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ مگر سید احمد شہیدؒ کا لشکر ایسے محفوظ مقام پر تھا جہاں غنیم کا پہنچنا محال تھا۔

مئی کے مہینے میں برف باری بند ہونے پر دونوں لشکروں میں حرکت پیدا ہوئی۔ شیر سنگھ کو حملہ کرنے کے لئے راستہ نہ مل پا رہا تھا وہ واپسی کا ارادہ کر رہا تھا کہ کچھ غداروں نے اسے ایک مخفی راستے کا پتہ دیا۔ اس طرح ۷ مئی ۱۸۳۱ء شیر سنگھ سامراج کی فتح کا نشان بن گیا۔ دست بدست جنگ میں سید احمد شہیدؒ مولانا اسمٰعیل اور دیگر سینکڑوں انقلابی مسلمان شہید ہو گئے۔ جو باقی بچے وہ شہیدوں کی تجہیز و تکفین سے بھی قاصر تھے۔ شیر سنگھ نے شہیدوں کا پورا احترام کیا۔ سید احمد شہیدؒ کی نعش کو قیمتی دوشالہ اوڑھایا گیا اور پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیئے گئے

سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیؒ کی وفات کے بعد اس تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان [illegible] بس میرٹھ: [illegible] حیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔ خود سید احمد شہیدؒ کی وفات کو بھی ان کے پرجوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مقدس ذریعہ بنا لیا تھا۔"

انقلابیوں کا نیا مرکز:

تحریک کے اس دردناک انجام کے بعد سید احمد شہیدؒ کے خاندان کے لوگ اور کچھ مجاہدین نواب وزیر الدولہ والیٔ ریاست ٹونک کی دعوت پر ٹونک تشریف لے گئے جہاں انہوں نے اپنی بقایا زندگی عبادت میں گزار دی۔ مگر باقی انقلابی مسلمان دوبارہ منظم ہوئے۔ نظم و ضبط قائم کیا اور "ستیانہ" کے سرحدی علاقے کو انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا محور بنایا۔

اس موقع پر مجاہدین نے قیادت مولانا نصیرالدین کو سونپ دی۔ آپ سید احمد شہیدؒ کے بھانجے تھے۔ اس طرح اس تحریک کے مردہ جسم میں ایک مرتبہ پھر روح پھونک دی گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تو اس واقع کے چند سال بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئی مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور سید احمد شہیدؒ کے پیروکار برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی سرزمین پر وبالِ جان بنے رہے۔

نئی راہیں:

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی کوششوں اور مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے سید احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیؒ جیسے حریت پسندوں نے برطانوی ہند میں ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے تاریخی لائحہ عمل کے [illegible] ہندوستان اور بالخصوص شمالی ہند [illegible] کے گوشے گوشے میں جو کانٹے بکھیر دئے تھے وہ

خونِ شہادت کے چھینٹوں سے سرسبز ہونے والے نہ تھے۔

بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہونے والے کا لہو ابھی خشک بھی نہ ہوا تھا کہ سرفروشانِ اسلام کا ایک گروہ "سنڈھیانہ"[1] میں جمع ہو گیا۔ انہوں نے مولانا نصیرالدین کو اپنا امیر منتخب کر کے سرنگوں جھنڈے کو دوبارہ سربلند کر دیا۔

سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد تحریک کے دو مرکز ہو گئے۔ دہلی کے پرانے مرکز نے انقلاب کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ہندو مسلم اشتراک اور متحدہ محاذ کی اساس بنی اور بعد ازاں (تقریبًا پچاس سال بعد) انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی مقصد قرار پائی۔ اسے بعد میں متحدہ قومیت کا عنوان دیا گیا۔

دوسرے مرکز صادق پور کا طریق کار اور لائحہ عمل وہی انقلابی رہا۔ یعنی ہجرت، جہاد، اور انگریز کو ملک بدر کرنے کے لئے تن من دھن کی قربانی۔ جو لوگ انقلابی اور جنگی نقطہ نظر رکھتے تھے وہ مجاہدین کے گروہ میں شامل ہوتے رہے۔ اس کے برعکس بے شمار محبانِ وطن اور فدائین جو ترک وطن کر کے محاذ آزادی پر نہ جا سکتے تھے، انہوں نے انقلابیوں کی امداد کا سلسلہ جاری رکھا، اور وہ اپنی تنخواہ کا ایک خاص حصہ بطور خاص ستیانہ کیمپ بھیجا کرتے تھے۔ جو زیادہ جوشیلے تھے وہ فدائین کے [illegible] شامل ہو کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

نیا امیر:

مولانا ولایت علی ایک بااثر اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا احمد علی "اردل" کے قاضی تھے۔ اس خدمت کے صلہ میں بادشاہ وقت کی طرف

---

[1] منشی محمد جعفر تھانیسری کے مطابق ان مجاہدین نے مولانا نصیرالدین کو اپنا امیر منتخب کیا اور سید اکبر کے پاس "ستیانہ" میں جمع ہو گئے۔

(سوانح احمدی ص ۱)

سے انہیں بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ آپ کی پرورش آپ کے نانا رفیع [illegible] صوبہ بہار کے آخری ناظم [illegible] رئیس نے کی تھی۔

مولانا ولایت علی جب [illegible] عمر کو پہنچے تو ایک پر تکلف اور بانکے [illegible] تھے۔ اعلیٰ قسم کا زربفت و زردوز، عطر میں بسا ہوا، آنکھوں میں سرمہ، دانتوں میں مسی اور ہتھیلیوں پر رنگِ حنا، کاکلیں آہن تاب شانوں پر پڑی ہوئی اور انگلیوں میں [illegible] اور چھلے۔ چوڑی دار پائجامہ اور پیروں میں زردوز وصلی کی جوتیاں۔ زمانے کے فیشن کے مطابق۔

خاندانی رواج کے مطابق آپ نے خاندانی اساتذہ سے تعلیم پائی۔ تکمیل علم کے لئے لکھنؤ گئے اور وہاں کے مشہور عالم و ماہر معقولات مولانا محمد اشرف سے عرصہ چار سال تک فیضیاب ہوتے رہے۔

اسی زمانہ میں سید احمد شہیدؒ لانگ مارچ کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ زبانِ خلق کے ذریعے ان کے اس عجیب و غریب قافلے کا چرچا مولانا محمد اشرف تک پہنچا۔ منطق و فلسفہ کے ذوق نے آپ کو تفتیش و تحقیق کا خوگر بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے سید احمد شہیدؒ سے تنہائی میں ملاقات کی۔

یہ مولانا ولایت علی ہی تھے جنہوں نے اپنے معزز استاد مولانا محمد اشرف کی ملاقات کے لئے سید احمد شہیدؒ سے وقت لیا اور جو اس وقت تخلیہ میں ثالث ثلاثہ بھی تھے۔ مولانا محمد اشرف، سید احمد شہیدؒ اور مولانا ولایت علی کے مابین یہ ملاقات قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔

سید احمد شہیدؒ نے شاہ پرستی کے پرانے کھنڈرات کو پیوند خاک کرنے اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے مطابق نئے نظام حکومت کے قیام کے موضوع پر جو گفتگو کی اس کے ایک ایک لفظ نے صداقت پسند استاد اور نوجوان شاگرد پر جادو کا اثر کیا۔

منطق و فلسفہ کی موشگافیاں ہوا ہو گئیں دل و دماغ کے تمام گنجینے متاعِ درد کی نذر ہوگئے اور ہمدردی خلق کا درد ان کے گوشۂ جگر میں اس طرح پناہ گزیں ہوا جس نے نہ صرف ان کو بلکہ مولوی ولایت علی کے عزیز و اقارب کو تمام عمر کے لئے بسمل نیم جاں بنا دیا۔ اس دوران استاد و شاگرد دونوں کی داڑھیاں روتے روتے تر ہوگئیں۔

ہندوستان کو برطانوی سامراج سے نجات دلانے کے لئے جب سید احمد شہیدؒ نے آزاد علاقے کی جانب ہجرت کا قصد کیا تو مولانا ولایت علی اور ان کے خاندان کے بعض دیگر افراد ان کے ہم رکاب تھے۔ آزاد قبائل میں مرکز کے قیام کے بعد مولانا ولایت علی سفارت کابل کے لئے نامزد کئے گئے۔ انقلابیوں کا نوجوان سفیر جب کابل پہنچا تو اس نے وہاں تبلیغ و اصلاح کا راستہ بھی اختیار کیا اور حالات سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم بھی رقم کی۔ کابل سے واپسی پر آپ کو حیدرآباد دکن میں انقلابی جدوجہد کے لئے متعین کیا گیا۔

حیدرآباد میں آپ کی تحریک کامیاب ہوئی۔ نواب ناصر الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ اس کے بھائی مبارز الدولہ نے آپ کی دعوت قبول کر لی۔ مگر انگریزوں کی وفادار ریاست کا حاکم مولانا ولایت علی کی نوائے تلخ کیونکر برداشت کرتا۔ چنانچہ دو سال کے مختصر عرصہ کے بعد آپ کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ آپ کے معتقد مبارز الدولہ کو نظر بند کر دیا گیا جبکہ اس کے ساتھی ریاست بدر کر دیئے گئے۔

مولانا اب بمبئی تشریف لے گئے۔ ابھی آپ وہاں بساطِ عمل بچھانے بھی نہ پائے تھے کہ معرکہ بالاکوٹ کے درد انگیز سانحہ نے آپ کو اپنی جدوجہد کو نئی شکل دینے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران پٹنہ میں آپ کے والد مولانا ماجد علی وفات پا گئے۔ چنانچہ برہان پور، جبل پور، نرسنگھ پور، کندولی اور سیون کا دورہ کرتے ہوئے آپ دو سال میں پٹنہ پہنچے اور کتاب انقلاب کے منتشر اوراق کی ترتیب میں مشغول ہو گئے۔

جماعت مجاہدین کی تشکیل نو

پٹنہ پہنچ کر مولانا ولایت علی نے تازہ سرگرمیوں کے لئے پرانے ساتھیوں کو منظم کیا، اور اپنا مرکز صادق پور کو بنایا۔ اس جماعت کے رہنما ارکان میں مولانا سید محمد علی رامپوری، مولانا شاہ محمد حسین [illegible] اور مولانا عنایت علی (مولانا ولایت [illegible] کے چھوٹے بھائی) اہم اور تحریک کے [illegible] ٹھہرائے گئے۔

انقلاب کی تحریک کو عوامی سطح پر پھیلانے کے لئے آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا طریق منتخب کیا۔

۱۔ عام مجمعوں میں تقاریر:

مجمعوں اور میلوں (مثلاً بہار کا میلہ چراغاں) میں تبلیغ کی غرض سے اپنے ساتھیوں سمیت پہنچتے۔ کھیتوں میں کسانوں، کارخانوں میں مزدوروں کو وعظ و پند کرتے اور ان کی بدتمیزی اور غصّے کو خاموشی سے پی جاتے۔ اس سفر کے دوران آپ گاؤں گاؤں جاتے اور تحریک کا انقلابی پیغام لوگوں تک پہنچاتے۔ اس طرح ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں خاصہ وقت صرف ہوتا۔ نماز جمعہ کے لئے کچھ مساجد مخصوص کر دی گئی تھیں۔ جمعہ کے یہ وعظ بڑے ولولہ انگیز تھے۔ ان میں سب سے زیادہ جہاد پر زور دیا جاتا تھا۔

۲۔ خاص مجمعوں میں درس:

مکان پر نماز ظہر تا عصر قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ مولوی عبداللہ (آپ کے بڑے بیٹے) قاری ہوتے۔ دیگر علماء ہاتھ میں تفسیر کی کتب رکھتے۔ اس کے علاوہ آپ کے ہمراہ مریدوں کی بھاری صف ہوتی۔

۳۔ تصنیف و تالیف:

آپ نے ضرورت کے مطابق مختصر اور عام فہم رسالے قلم بند فرما کر لوگوں کے حوالے کئے۔ اس قسم کے رسائل کی تعداد تیس سے کم نہ رہی ہوگی۔ اگرچہ صرف چند رسالے اب تک دریافت ہو سکے ہیں۔

م۔ طیب عاطر

علامہ سید سلیمان ندوی

یک نفس در محبت با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

علامہ سید سلیمان ندوی ۱۴ ربیع الاول بمطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔۔۔!

آپ نیک نفس پاک طینت، خوش اخلاق کم گو، بامروت، عالم باعمل، صائب الرائے، مستقیم المزاج باعزم ملت کے رکن رکین اور جماعت علماء کے فرد فرید تھے۔ کتب بینی کے گرویدہ، علمی تحقیق کے دلدادہ اور وضعداری کے پابند تھے اور علمی فیض رسانی کے خواہاں رہتے تھے۔

آیئے! آج تھوڑی دیر سید صاحب کی یادوں کی محفل میں بیٹھیں کہ ایسی ہستی کا ذکر بھی بڑی سعادت ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ کبھی میں علامہ سید سلیمان ندوی کے قریب رہا ہوں یا ان سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کی تحریروں اور ان کے شاگردوں سے فیض ضرور اٹھایا ہے۔ ان میں مولوی صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، مولانا عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی ڈائرکٹر موتمر عالم اسلامی اور مولانا ناظم ندوی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے تو اس طرح ایک ہی تاریخ کو دنیا کی کس ہستی کی ولادت اور وفات ہوئی تھی انہی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیرو لکھ کر سید سلیمان ندوی زندۂ جاوید ہو گئے اور کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

قبل اس کے کہ میں اپنے اصل موضوع کی طرف آؤں، سید العلماء کی زندگی کے کچھ حالات لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ علامہ صاحب پٹنہ (صوبہ بہار) کے ایک مشہور ومعروف گاؤں "دینہ" کے رہنے والے تھے۔ وہ دہیں ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ سید صاحب کا یہ قریہ بھی لندن کے "چیلسی" سے کم نہیں کیونکہ یہاں بھی بڑے بڑے مشاہیر پیدا ہوئے۔ اس طرح اگر دینہ کو بہار کا چیلسی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

سید صاحب کے والد کا نام سید ابوالحسن اور بڑے بھائی کا نام مولانا حکیم ابو حبیب تھا بھائی تو اپنے علاقے میں مطب کرتے تھے لیکن والد صاحب بہار کی ایک مسلم ریاست اسلام پور کے دربار کے طبیب تھے۔ سید صاحب کے دادا محمد شبیر صاحب بھی طبابت کا مشغلہ کرتے تھے۔ مولانا محمد شبیر صاحب کے ایک بھائی مولانا مصطفٰے شیر تھے۔ یہ سہسرام میں شیر شاہ سوری کے مقبرے سے ملحق ایک قدیم دینی درس گاہ کے صدر مدرس تھے۔

ادھر ضلع مونگیر کے ایک مولوی صاحب جن کا نام مقصود تھا۔ سید صاحب کے پہلے استاد تھے۔ ان سے سید صاحب نے ۱۲-۱۳ سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پھلواری شریف چلے آئے اور وہاں سے دربھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد مولانا کے چچا سید حافظ شاہ تجمل حسین صاحب نے جو ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے، سید صاحب کے والد محترم کو مشورہ دیا کہ انہیں ندوۃ العلماء میں داخل کر دیجئے۔ ان کی یہ خواہش منظور کر لی گئی اور علامہ صاحب کو ان کے پھوپھی زاد مولوی محمد احسن صاحب کے ساتھ ندوہ بھیج دیا گیا۔ سید صاحب ندوہ میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۲ء تک رہے۔ اوّلاً چھ سال بحیثیت طالب علم کے اور ثانیاً چھ سال بحیثیت مدیر "الندوہ" اور استاد کے۔ ان کی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ وہ یہ کہ مارچ ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ کے رفاہ عام کلب میں دستار بندی کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں سید صاحب نے بھی تقریر کی۔ اس جلسے کے بارے میں وہ خود یوں رقم طراز ہیں:-

"اسی تقریر کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشگاہ اور سامعین کو آئینہ حیرت بنا دیا۔ عین راقم کی تقریر کے اثناء میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بلاشبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کر لیں۔ مولانا شبلی صاحب حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے اس لئے مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کر سکتے ہو! میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کر دی۔ جلسہ پر ایک سماں چھا گیا۔

مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً ۔۔۔۔ اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت کیا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ تو مولانا نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس طالبعلم (سلیمان ندوی) نے جو تقریر کی ہے اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے ہیں۔ اس بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع دے سکتے ہیں، یہ اسی پر تقریر کریں گے۔ چنانچہ موضوع

کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین کا نام پیش کیا، جو اس زمانے میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ انہوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی؟" میں نے اسی موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے۔ ہر طرف احسنت و آفرین کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں۔ استاد محترم نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے طرۂ افتخار بن گیا۔"

(حیات شبلی نمبر ۴۸۷)

ایک مختصر سا واقعہ لکھنے کے بعد اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ علامہ عبدالقدوس صاحب ہاشمی سید صاحب کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"دوسرے علوم و فنون میں سید صاحب کی جامعیت کے علاوہ یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اسلام پر دنیا کے سب سے بڑے عالم یہی تھے۔ میں نے سید صاحب کے متعلق یہ تعریف مصر، عراق، حجاز اور شام میں سُنی اور ہندوستان و پاکستان کے اہل علم و نظر سے بھی۔"

مولانا ہاشمی ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"پٹنہ میں ایک بار مولانا کی خدمت میں ہم چند طلباء حاضر تھے۔ مجھے ان دنوں سرزمین ہند میں مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر ایک مقالہ لکھنا تھا۔ ایک بڑی مشہور علمی کانفرنس میں یہ مقالہ پیش کیا جانے والا تھا۔ میں اس مقالے کا خاکہ حضرت کی خدمت میں پیش کر رہا تھا۔ فرمایا تمہیں معلوم ہے کہ محمد ماموں کے بعد سے یوسف لنگاہ کے دور تک تقریباً ساڑھے چار سو سال تک تاریخ سندھ کے متعلق کافی معلومات کیوں نہیں ملتیں۔؟" خود ہی جواب دیا کہ "سندھ میں تاریخی تصانیف کا کوئی ذوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور دربارِ خلافت سے منقطع ہو کر طوائف الملوکی نے عرب مصنفین کو ان سے بے تعلق بنا دیا تھا۔" یہ تھا مولانا کی تاریخ دانی کا عالم، اس کے باوجود ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں، "خود تحقیق کر لو، جب تک خود تحقیق نہ کر لو کچھ نہ لکھو۔ تحقیق کر لینا۔ میری گفتگو پر بھروسہ نہ کرنا۔"

حق گوئی اور بے باکی کی ایک مثال بھی دیکھتے چلیے۔ راوی اس واقعہ کے علامہ ہاشمی ہی ہیں:

"ایک بار مجلس اتحاد المسلمین کے مرکز دارالسلام میں سید صاحب تقریباً بیس پچیس ہزار کے مجمع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے حالات بتا رہے تھے۔ تقریب کے اختتام پر ایک نوجوان نے سوال کیا کہ مولانا! اسلام میں بادشاہت کارفرما تھی اور شاہی چشم و ابرو کے اشاروں سے قسمتیں بدل جاتی تھیں۔ اس قسم کے سوالات کا جواب دینا آسان کام نہ تھا۔ مصلحت بینی کو بہتوں کے ایمان و تقویٰ پر غالب آتے ہوئے میں نے دیکھا ہے۔ سوال سُن کر میں اور سارا مجمع گوش بر آواز ہو گیا۔ لوگ نہ جانے کس کس الفاظ کے گورکھ دھندے میں جواب گم ہونے کی امید کر رہے تھے لیکن اللہ تعالےٰ اپنی رحمتوں میں جگہ دے علامہ سید سلیمان ندوی کو انہوں نے نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ "اسلام میں کسی قسم کی بادشاہت کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور نہ کسی غاصب اختیارات کی اطاعت جائز ہے۔" سارا مجمع چُپ تھا اور تو اور نواب بہادر یار جنگ چپ تھے اور بولے تو صرف اسقدر کہ سبحان اللہ بحمدہ حق تو یہی ہے جو حضرت نے فرمایا۔" اس حق گوئی کا نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا۔ دوسرے ہی دن مولانا کو حیدرآباد میں تقریروں کی ممانعت کر دی گئی۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے سید صاحب با مروت اور خوش اخلاق تھے، تو یہاں اس کی مثال بھی دیکھتے چلیں۔ اس سلسلے میں جناب رئیس احمد جعفری کے ایک مضمون سے اقتباس نقل کر رہا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک روز سید صاحب ندوہ میں تشریف لائے۔ انہوں نے چاک سے بلیک بورڈ پر لکھا۔ حسب ذیل الفاظ چھوٹے چھوٹے عربی جملوں میں کھپائیے:-

۱۔ چھڑی۔ ۲۔ میز ۳۔ پلیٹ دیا سلائی لوٹا۔ سب لڑکے سر جھکا کر لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میرے پاس میرے ایک ہم وطن دوست بیٹھے تھے۔ وہ ٹوٹے پھوٹے جملے تو کسی طرح بنا لیتے تھے لیکن اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ شاید کوئی عربی نام انہیں یاد نہیں تھا۔ میں ابھی ایک جملہ بھی نہیں لکھ پایا تھا کہ اختر صاحب نے ٹھوکا لگایا اور رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا:

چھڑی کی عربی کیا ہے؟

میں نے کہا سکین ... لیکن اب نہ پوچھنا خود میری جان پر بنی ہوئی ہے اور اگر کہیں باتیں کرتے سید صاحب نے دیکھ لیا تو اور غضب ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر میں پھر انہوں نے ٹھوکا لگایا اور پوچھا: میز کی عربی کیا ہے؟

میں نے کہا العندوز۔

انہوں نے لکھ لیا۔ پھر دریافت کیا۔ پلیٹ کو کیا کہتے ہیں۔

میں نے جواب دیا الخزاطیں

یہ بھی جلدی سے لکھ لیا۔ پھر فوراً سوال ہوا۔ اور دیا سلائی؟

میں نے پورے اطمینان کے ساتھ بتایا: الحمراد ... یہ بھی نوٹ کر لیا گیا۔۔ اب ایک ہی لفظ رہ گیا تھا۔ پوچھا لوٹا ... لوٹے کو کیا کہتے ہیں؟

میں نے محبت بھری نظروں سے انہیں دیکھ کر کہا: العبزاء لکھ لو۔

بے چارے نے پوری سعادت مندی سے یہ بھی لکھ لیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد ہم سب نے اپنی اپنی کاپیاں سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔ غلط جملے کاٹ دیئے۔ قابلِ اصلاح جملوں پر اصلاح دے دی۔ سب کی کاپیاں مل گئیں۔۔

لیکن اختر صاحب یونہی بیٹھے رہے۔ سید صاحب نے پوچھا، یہ کاپی کس کی ہے؟

اختر صاحب انعام کی امید میں کھڑے ہو گئے۔ سید صاحب نے انہیں ایک نظر دیکھا اور فرمایا۔ یہاں آؤ۔

خوش خوش پہنچے۔ سید صاحب نے پوچھا: آپ نے یہ الفاظ کس لغت میں دیکھے ہیں؟

کہیں دیکھے ہوتے تو بتاتے، چپ۔۔۔

اب کی سید صاحب نے بارعب آواز میں فرمایا: آپ الفاظ تصنیف کرتے ہیں؟

اختر صاحب کی سٹی گم ہو گئی لیکن فوراً ہی وہ اعلائے کلمۃ الحق پر تل گئے۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرکے بڑے معصوم لہجے میں فرمایا: انہوں نے بتائے ہیں۔

اب میری پیشی ہوئی ہے۔ سید صاحب نے ایک تبسم کے ساتھ پوچھا: یہ کیا حرکت تھی؟ میں نے کہا۔ پہلا لفظ میں نے صحیح بتا دیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ اب نہ پوچھنا۔ لیکن یہ پوچھتے گئے۔ میں نے بھی جو دل میں آیا بتا دیا۔ سید صاحب نے شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا مسکرائے اختر کو کاپی دی اور چلے گئے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب سید صاحب کے سلسلے میں لکھتے ہیں، ۷ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی مرحوم مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ ۱۵ نومبر کو مولانا نے سید صاحب کو پونہ، کلکتہ اور دینہ کے پتے سے تار بھجوائے۔

سید صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت میں بانکی پور میں تھا۔ مجھے ان تاروں میں سے کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کچھ کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔ لیکن آہ! جب

۱۵ نومبر کی شام کو پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی مولانا نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ "اب کیا رہا"۔ لوگوں نے جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلایا تو جسم میں فوری طاقت آ گئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کر دو"۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ضرور! ضرور۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ شاگرد نے اپنے شفیق استاد کی نصیحت کی ایسے انداز میں تعمیل کی کہ رہتی دنیا تک اس کا نقش زائل نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء سے سید صاحب نے دارالمصنفین کو اپنا علمی، مذہبی اور قومی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔

حکومت پاکستان کے مسلسل اصرار پر بالآخر علامہ سید سلیمان ندوی ؒ ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کو کراچی آئے۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے بہت سے دینی اور ملی کام کئے۔ اس ملی کام کی تفصیل لکھنا آسان نہیں کیونکہ ع

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

آخر میں سید صاحب کی ان دو خواہشوں کا تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو سید صاحب ملت اسلامیہ کے لئے اپنے دل میں رکھتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ:

(الف) اوّلاً نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ ہر شخص ضروریاتِ دین سے واقف ہوتے ہوئے دینی علوم میں کمال پیدا کر سکے اور

(ب) ثانیاً دارالمصنفین کی طرح ادارہ قائم کیا جائے تاکہ ملت اسلامیہ میں دین کا صحیح مذاق عام ہو۔

یہاں میں ایک بات کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے' اس سے مراد دینی علم ہے نہ کہ دنیاوی۔ یار لوگوں نے اس کو غلط رنگ دے کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے اور ٹھیک اسی طرح ایک حدیث کہ جس میں کہا گیا ہے کہ اگر علم سیکھنے کے لئے

چین کا سفر بھی کرنا ہو تو کرو، لیکن اس کا بھی غلط معنی نکال کر لوگ امریکہ اور لندن جا کر علم تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن واپسی پر بجائے مسلمان کے امریکی یا انگریز بن جاتے ہیں۔ چنانچہ آج کے دور میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے دینی علم اس حد تک تو حاصل کرے کہ اسے کوئی صراطِ مستقیم سے بھٹکا نہ سکے اور سید صاحب کا منشا بھی یہی تھا۔

آج کا دور سید صاحب کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے سب سے زیادہ بہتر ہے۔ کاش اربابِ حکومت اور پاکستانی مسلمان اس طرف توجہ دے سکیں تاکہ پاکستان، عالم اسلام اور پوری دنیا آرام و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔

آج سید صاحب ہم لوگوں کے درمیان نہیں لیکن ان کے فرمودات' ان کی تحریریں اور ان کے اقوال جو کہ احکام اسلامی ہی ہیں ہمارے پاس موجود ہیں اور اسے مشعل راہ بنا کر ہم کامیابی اور کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔

بقیہ: مولانا ابوالحسن علی ندوی

اس وقت پاکستان کو ایک ضرب کلیمی کی ضرورت ہے بلکہ تمام عرب اور اسلامی ملکوں میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ اسلام کے عقائد و حقائق پر ایک نیا یقین ایک نیا اعتماد ایک سرور ایک نیا نشہ ایک نیا ولولۂ عمل، نئی جرأت اندیشہ، ایک نئی لذت کردار ایک نیا جذب و دروں پیدا کرے جن سے ان ادھ [illegible] قوموں آمادہ زوال [illegible] ان [illegible] قوموں کو [illegible] کے قدم جب ڈگمگا رہے [illegible] رہے ہیں' ان کو نئی [illegible] سے آشنا کریں۔ آپ کی [illegible] محدود نہیں ہے۔ بحر غیر کے مسلمان تعداد کے لحاظ سے تمام عالم اسلام پر فائق ہیں۔ آپ فکری طور پر عالم اسلام کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھیں اور اسلام پر اعتماد پیدا کریں۔ اور یہ ثابت کریں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں اسلام چل سکتا ہے پاکستان ایک معمل ایک تجربہ گاہ ہے جو یہ ثابت کرے گا کہ اسلامی نظریات اس دور میں چل سکتے ہیں اور

محمد نعیم ترین

امیر المومنین عمر الفاروق رضی اللہ عنہ

خسر رسول صلی اللہ علیہ وسلم، داماد علیؓ

صدیق اکبرؓ کے بعد آپؓ کی ہی تجویز سے حضرت عمرؓ خلیفہ وجانشین قرار پائے اور امت کی ہر نوع کی ظاہری و باطنی ترقیات کی باگ آپ کے ہاتھ میں آئی —

حضرت عمرؓ کے قبولِ خلافت کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے مرض نے شدت پکڑی اور وصال کا وقت قریب ہوا، تو آپؓ نے حضرت علیؓ و حضرت عثمانؓ اور چند مہاجرین و انصار کو بلایا اور فرمایا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ میری حالت کیا ہو رہی ہے اور کسی آدمی کا تعین جو میرے بعد تمہارے امور انتظام کرے، ضروری ہے۔ اگر تمہاری رائے ہو تو تم آپس میں کسی کو مشورہ سے طے کر لو۔ اور اگر تمہاری رائے ہو تو میں انتخاب کروں۔

عرض کیا کہ آپ ہی انتخاب فرمادیں —

چنانچہ آپ نے حضرت عثمانؓ کو حکم دیا اور انؓ سے حضرت عمرؓ کے خلیفہ بنانے کا فرمان لکھوایا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ میں اس کام کا تحمل نہیں کر سکتا لیکن پھر مجبوراً خلافت قبول کرنے پر رضامند ہوئے۔ اس کے بعد حضرت طلحہؓ حاضر ہوئے اور انہوں نے اس تجویز منصب پر گفتگو کی۔ اس پر فرمایا کہ عمرؓ بخدا تمہارے لئے بہتر آدمی ہیں۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ سے یہ پروانہ لکھوایا:

"یہ عہد نامہ ہے جس کو ابوبکرؓ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت میں لکھوایا جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے، اور سفرِ آخرت شروع کر رہا ہے، میں نے تمہارے لئے اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ بنایا اگر وہ نیکوکار رہے اور انصاف کرتے رہے تو انؓ کے بارے میں میرا یہی حسن ظن ہے، اور اگر ان میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا تو مجھ کو غیب کا علم نہیں۔ میں نے اپنے خیال میں تمہارے لئے اس انتخاب کے ذریعہ بھلائی اور بہتری کی ہے، اور جو کوئی آدمی گناہ کرتا ہے اس کا وبال اس پر پڑتا ہے۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"

(صبح الاعشیٰ ص ۳۴۹، ۹۷)

آپ کا اسم گرامی عمرؓ ہے اور لقب فاروق، ابوحفص کنیت ہے۔ یہ لقب اور کنیت دونوں دربارِ نبوی سے مرحمت ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے:

عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن ریاح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن غالب القرشی العدوی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعب بن لوی پر آپؓ کا نسب جا ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ولادت واقعہ فیل سے ۱۳ سال بعد ہوئی۔ ۲۷ سال کی عمر تھی کہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان سے پہلے چالیس مرد اور گیارہ عورتیں اسلام میں داخل ہو چکی تھیں۔

قبول اسلام:

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ وہ یہ کہ ایک روز کفار کی مجلس منعقد ہوئی، جس میں یہ سوال اٹھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کون قتل کر سکتا ہے۔ عمرؓ نے کہا یہ کام میں انجام دوں گا۔ یہ کہہ کر تلوار اٹھائی اور چل دیئے۔ راہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص ملے۔ دریافت کیا:

عمرؓ! کہاں جا رہے ہو؟

کہنے لگے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی فکر میں ہوں۔

حضرت سعد نے فرمایا۔ بنو ہاشم بنو زہرہ بنو عبدالمناف تم کو اس کے بدلے میں قتل کر دیں گے۔

اس جملہ کو سن کر غصہ آگیا اور فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی بددین یعنی مسلمان ہو گئے ہو۔ آ پہلے تجھ کو ختم کر دوں۔ یہ کہہ کر تلوار کھینچ لی۔ حضرت سعدؓ نے یہ کہہ کر کہ ہاں میں مسلمان ہوں، تلوار نکالی۔ ایک دوسرے پر حملہ ہونے ہی کو تھا کہ حضرت سعدؓ بولے:

عمرؓ پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو۔ تیری بہن اور بہنوئی دونوں اسلام قبول کر چکے ہیں۔

یہ سن کر طیش میں آگئے اور فوراً اپنی بہن کے گھر گئے۔ دیکھا کواڑ بند ہیں اور حضرت خبابؓ ان دونوں میاں بیوی کو قرآن پڑھا رہے ہیں۔ آواز سن کر حضرت خبابؓ تو مکان ہی میں چھپ گئے۔ وہ صحیفہ جس پر آیات قرآنی لکھی ہوئی تھیں، جلدی میں باہر رہ گیا۔ بہن نے کواڑ کھولے۔ اس وقت حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں

کوئی چیز تھی جسے پوری قوت سے بہن کے سر پر دے مارا۔ خون بہنے لگا۔ فرمایا:

اپنی جان کی دشمن! تو بھی بددین ہوگئی۔ اندر گھر میں آکر دریافت کیا کیا کر رہے تھے۔ یہ آواز کیسی تھی، کس کی تھی؟

بہنوئی نے کہا: آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

فرمایا: اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لیا۔

بہنوئی نے کہا کہ اگر وہ دین برحق ہو تو کیا حرج ہے۔

یہ سننا تھا کہ ان پر بے تحاشہ ٹوٹ پڑے اور زمین پر گرا کر خوب مارا۔ بہن نے آگے بڑھ کر بچانے کی کوشش کی تو ان کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ خون نکل آیا۔ یہ بھی آخر کار عمرؓ کی بہن تھیں۔ کہنے لگیں:

عمرؓ! کیا ہم کو اس وجہ سے مارا جاتا ہے کہ ہم اسلام لے آئے، یقیناً ہم اسلام لے آئے جو تم سے ہو سکے وہ کر لو۔

اتنے میں حضرت عمرؓ کی نظر اس صحیفہ قرآن پر پڑگئی جو باہر ہی رکھا تھا۔ کہنے لگے کہ مجھے بھی دکھلاؤ اس میں کیا لکھا ہے۔

بہن نے کہا کہ تم ناپاک ہو اور ناپاک آدمی اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ حضرت عمرؓ نے بہت اصرار کیا مگر بہن بے بغیر وضو اور غسل کے وہ صحیفہ ہاتھ میں نہیں دیا۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور صحیفہ اٹھایا تو اس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی:

انّنی انا اللہ لا الٰہ الا انا
فاعبدونی واقم الصلوٰۃ
لذکری۔ یہ پڑھا تھا کہ حالت بدل گئی۔ فرمانے لگے۔ مجھے بھی دربار نبی میں لے چلو۔ یہ بات سُن کر حضرت خبابؓ اندر سے نکلے اور فرمایا

اے عمرؓ! کل شب پنجشنبہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی کہ اے اللہ! عمر اور ابوجہل میں جو تجھے زیادہ پسند ہو اس کو اسلام کی توفیق عطا فرما۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا آپ کے حق میں قبول ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ دربار نبوی میں پہنچے اور جمعہ کے دن صبح کو اسلام لائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ عمر کا اسلام لانا مسلمانوں کی فتح تھی اور ان کی ہجرت مسلمانوں کی مدد تھی اور ان کی خلافت رحمت۔

ہجرت عمرؓ:

حضرت عمرؓ کی ہجرت کا واقعہ بھی کافی عجیب ہے جس سے ان کی شجاعت اور بہادری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ

اول اول ہر شخص نے خفیہ طریقہ سے ہجرت کی، مگر جب حضرت عمرؓ نے ہجرت کی تو اس شان سے کی کہ تلوار گلے میں ڈالی اور کمان ہاتھ میں لی، بڑی تعداد میں تیر ساتھ لئے۔ سب سے پہلے مسجد میں اطمینان سے طواف کر کے نماز پڑھی۔ پھر کفار کے مجمع کی طرف گئے اور فرمایا جس کا دل یہ چاہے کہ اس کی ماں اسے روئے، اس کی بیوی بیوہ ہو، بچے یتیم ہوں، وہ مکہ سے باہر آکر عمرؓ کا مقابلہ کرے۔ یہ فرما کر تشریف لے گئے۔ کسی کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ آ کر مقابلہ کرتا۔

لیکن اس شجاعت اور بہادری کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر حیرانگی اور پریشانی کا یہ عالم تھا کہ ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ جو شخص بھی یہ کہے گا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا میں اس کی گردن اڑا دوں گا، بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور اپنے رب سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔

آپؓ کی سمجھ، ذکاوت، ذہانت، بیدار مغزی، انتظام سلطنت، سیاست، رُعب و عدل و انصاف آج دشمنوں کی زبان پر جاری ہیں مگر بدیں دبدبہ و ہیبت آپؓ کے زہد و فقر کی نظیریں بھی بکثرت ہیں۔ چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔

آپ کی زندگی نہایت فقیرانہ تھی۔ کرتے میں تین تین چار چار پیوند ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے تمام کرتے کے پیوند شمار کئے تو چودہ تھے۔ بسا اوقات پیوند لگانے کے لئے کپڑا نہ ملتا تو چمڑے کے ٹکڑے ہی کا پیوند لگایا جاتا۔ ایک مرتبہ قمیص میں دونوں مونڈھوں کے درمیان چار پیوند لگ رہے تھے۔ حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سترہ پیوند ان کے لباس میں شمار کئے۔

دسترخوان پر دو سالن کبھی جمع نہ ہونے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ صاحبزادی حضرت صفیہؓ نے سالن ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے اس پر گھی ڈال دیا، تو آپ ناراض ہوئے کہ ایک ہی برتن میں دو سالن کر دیئے۔

ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے لئے تشریف آوری میں دیر ہوئی تو تاخیر کی یہ معذرت فرمائی کہ کپڑا کوئی اور نہیں تھا، اس لئے اسی کو دھویا جس میں دیر لگ گئی۔

ایک بار فرمایا کہ اگر حساب کا خوف نہ ہوتا تو بُھنا ہوا گوشت کھاتا۔

جن لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ عرب میں گرمی اور شدت دھوپ کی کیا حالت ہے، مگر حضرت عمرؓ کے لئے مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ تک کسی منزل پر خیمہ وغیرہ نہیں لگایا جاتا تھا۔ کیکر وغیرہ کے سایے میں آپؓ کے لئے چمڑہ بچھا دیا جاتا، اسی پر آرام فرماتے۔

آپؓ کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑا اور نو ماہ تک رہا۔ اس پر آپؓ نے گھی اور گوشت کھانا ترک فرما دیا کہ غرباء کو تو میسر نہ ہو اور میں کھاؤں اور قسم کھائی کہ زیتون کے تیل کے سوا کسی چیز سے روٹی نہیں کھاؤں گا۔ حتیٰ کہ زیتون کا تیل بکثرت استعمال کرنے کی وجہ

سے چہرہ انور پر اثر آگیا تھا اور اسی قحط میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ:

اے اللہ! میرے ہاتھوں اُمّت کو ہلاک نہ فرما۔

گھروں میں جاکر لوگوں سے ان کی ضروریات دریافت فرماتے اور تاکید کرتے کہ اپنی ضرورتوں کو مجھ سے بیان کرو۔

رونے کی یہ حالت تھی کہ گریہ وزاری کی وجہ سے چہرہ پر آنسوؤں کی دو سیاہ لکیریں بن گئی تھیں۔ نماز میں خوف سے اسقدر رویا کرتے تھے کہ پیچھے تین صفوں تک رونے کی آواز جایا کرتی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت میں بعض آیات پر رونے سے اتنا غلبہ ہوتا تھا کہ روتے روتے دم گھٹنے لگتا تھا۔ بعض مرتبہ گر جایا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے:

کاش میں بجائے آدمی ہونے کے ایک بکرا ہوتا کہ مجھے ذبح کر کے کھا لیا جاتا۔

بسا اوقات ایک تنکا ہاتھ میں لے کر فرماتے:

کاش میں یہ تنکا ہوتا۔

کبھی فرماتے:

کاش میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا۔

لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری دنیا کو نقصان پہنچ جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ تمہاری آخرت کو نقصان پہنچے۔ یتیموں اور بیواؤں کے لئے چمڑے کے تھیلے میں آٹا بھر کر اپنی کمر پر لاد کر لے جاتے۔ اگر کوئی درخواست کرتا کہ میں اٹھاؤں تو فرماتے کہ قیامت کے دن میرے گناہوں کو کون اٹھائے گا۔ آپ کا مقولہ تھا کہ کاش میں دنیا سے ایسی حالت میں جاؤں کہ وہاں مجھے کوئی اجر ملے نہ کوئی مطالبہ ہو۔

ابتداءً مزاج میں بہت سختی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ابتداءِ خلافتِ فاروقی میں لوگوں نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ دیکھ کر آپؓ نے ایک طویل خطبہ دیا۔ اس میں فرمایا:

لوگو! میں اس وقت تک نرم تھا جب تک تم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ جیسے نرم اور مہربان تھے۔ میری سختی اور ان کی نرمی دونوں مل کر اعتدال پیدا کر دیا کرتی تھیں۔ مگر اب میں تم پر تشدد نہ کروں گا بلکہ میری سختی صرف ظالموں کے لئے ہے۔

اے لوگو! اگر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حضرت ابوبکرؓ کی سیرت کی مخالفت کرکے کوئی حکم دوں تو تم کیا کرو گے؟

جب کئی مرتبہ یہ جملہ ارشاد فرمایا تو ایک آدمی تلوار لے کر کھڑا ہوا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: **فعلنا هكذا** یعنی تلوار سے سر اڑا دیں گے۔ اس جملہ سے آپ پر ذرہ بھر اثر نہ ہوا بلکہ خوش ہوئے۔ جب ملک شام گئے تو بوسیدہ لباس زیب تن فرما رکھا تھا جس میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ عرض کیا گیا کہ آج یہود و نصاریٰ کے بڑے بڑے علماء زیارت کرنے آئیں گے ان کو کیا خیال گزرے گا۔ فرمایا: ہمیں اللہ نے اسلام کے ذریعے عزت دے رکھی ہے۔ لباس سے ہماری عزت نہیں ہوتی۔

یہ واقعات ہیں آپؓ کے زہد کے اللہ کے ساتھ خوف کے اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان کے، ورنہ جنت کی بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بہت پہلے سُن چکے تھے اور مبشر بالجنۃ ہونے کے باوجود خوفِ حق کا اسقدر غلبہ تھا کہ حضرت حذیفہؓ سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو میرا نام منافقین میں نہیں فرمایا۔ حضرت حذیفہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے نام بتلا رکھے تھے۔

انتقال:

فجر کی نماز میں ابو لولو مجوسی نے آپؓ پر حملہ کیا۔ زخم کاری لگا جس سے ہر وقت خون بہتا تھا اور کبھی غفلت بھی ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود جب نماز کے لئے کہا جاتا تو اسی حالت میں نماز ادا کرتے اور فرماتے:

"اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں جو نماز چھوڑ دے"۔

یکم محرم ۲۴ھ کو انتقال فرمایا۔ انتقال کے وقت آپؓ کا سر صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کی ران پر رکھا ہوا تھا۔ فرمایا کہ میرا سر زمین پر رکھ دو۔ عرض کیا کہ اگر ران پر ہی رہے تو کیا مضائقہ ہے۔ مگر اصرار کے بعد اپنا سر زمین پر رکھوا لیا اور فرمایا کہ اگر میرا رب مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میرے لئے ہلاکت ہے۔ حضرت صہیبؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

"خلافت کی کل مدت دس سال، چھ ماہ، پانچ دن ہوئی رضی اللہ عنہ وارضاہ"۔

متفرق واقعات:

۱۔ تواضع کی صفت آپؓ میں اسقدر تھی کہ اس کا اندازہ کرنے سے عقل انسانی عاجز ہے عرب و عجم کا بادشاہ بلکہ بادشاہوں کا فرمانروا، اور اس میں اسقدر تواضع۔

خلیفہ ہونے کے بعد منبر پر جو گئے تو منبر کے اس زینے پر بیٹھے جس پر حضرت صدیقؓ پاؤں رکھتے تھے۔ لوگوں نے کہا اوپر بیٹھ جائیے تو فرمایا میرے لئے یہی کافی ہے کہ مجھے اس مقام پر جگہ مل جائے جہاں صدیق اکبرؓ کے پاؤں رہتے ہوں۔

۲۔ ایک روز خطبے میں فرمایا: اے لوگو! عورتوں کا مہر زیادہ نہ باندھا کرو۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں سے زائد اگر ہوگا تو میں اس سے زائد مقدار کو ضبط کرکے بیت المال میں داخل کردوں گا۔ ایک بڑھیا بول اٹھی کہ آپ کو ایسا کرنے کا کیا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وآتيتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شيئا، اے شوہرو اگر تم اپنی بیویوں کو بہت سا مال دیدو تو پھر اس میں سے کچھ [illegible]

بس اس کو سُن کر منبر سے یہ کہتے ہوئے اتر آئے کہ کل الناس اعلم من عمر حتی العجائز، یعنی سب لوگ عمر سے زیادہ علم رکھتے ہیں حتیٰ کہ بڑھیا بھی۔

۳۔ کھانے کا یہ حال تھا کہ اس وقت کوئی ادنیٰ شخص بھی اس کھانے کو بہ رغبت نہ کھا سکتا تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ تین روٹیاں آپؓ کے لئے آتی تھیں، جن میں کبھی روغن زیتون لگا ہوا ہوتا تھا کبھی گھی اور کبھی روٹیوں کے ساتھ دودھ ہوتا تھا اور کبھی سکھایا ہوا گوشت جو کوٹ کر ابال لیا جاتا تھا اور کبھی تازہ گوشت بھی ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ عراق سے کچھ مہمان آپؓ کے پاس آئے جن میں حضرت جریر بن عبداللہ بھی تھے ان لوگوں سے آپ کا کھانا نہیں کھایا گیا۔

۴۔ قیام بیت المقدس کے زمانے میں آپؓ کا کرتہ پشت کی جانب سے پھٹ گیا تو آپؓ نے کسی کو دیا کہ دھودے اور پیوند لگا دے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور اچھے کپڑے کا نیا کرتا بھی آپؓ کے لئے بنا دیا گیا اور دونوں آپؓ کے سامنے پیش کئے گئے۔ آپ نے نئے کرتے پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ "یہ بہت نرم کپڑا ہے اور واپس کر دیا اور فرمایا کہ میرا وہی کرتا اچھا ہے۔ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔"

ایک بار خلاف معمول گھر میں زیادہ دیر تک رہے۔ جب باہر نکلے تو فرمایا کہ دیر اس وجہ سے ہوئی کہ کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ ان کو میں نے دھویا۔ جب وہ خشک ہو گئے تو پہن کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا کہ اس کو پہن لیتے۔

۵۔ ایک مرتبہ تقریباً پچاس صحابہ کرامؓ جو مہاجرین میں سے تھے، مسجد نبوی میں جمع ہوئے ان میں باہم حضرت عمر فاروقؓ کے زہد کا تذکرہ تھا۔ کہنے لگے دیکھو تو قیصر و کسریٰ کی سلطنت جس کے قبضہ میں ہے، مشرق و مغرب میں جس کا حکم چل رہا ہے، عرب و عجم کے وفود جس کے پاس آتے ہیں اور اس کو اس حالت میں دیکھتے ہیں کہ اس کے لباس میں بارہ بارہ پیوند لگے ہوئے ہیں، ان سے کہنا چاہیئے کہ وہ اس لباس کو بدل دیں۔ اچھا کپڑا پہنا کریں کہ عمدہ لباس سے بھی ایک ہیبت ہوتی ہے اور کھانے کا بھی کوئی عمدہ انتظام کیا جائے۔ دونوں وقت وسیع خوان بچھا کریں، اور مہاجرین و انصار جو ان سے ملنے آتے ہیں وہ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوا کریں۔ لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمر فاروقؓ سے کچھ کہتا۔ آخر سب کی رائے ہوئی کہ حضرت علیؓ سے کہنا چاہیئے، وہ ان کے خسر ہیں وہ ان سے کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ سب لوگ حضرت علیؓ کے پاس گئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں ایسی بات اُن سے نہ کہوں گا۔ امہات المومنین سے کہلوانا چاہیئے۔ احنف بن قیس کہتے ہیں کہ پھر وہ لوگ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے پاس گئے۔ دونوں ایک ہی جگہ مل گئیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اچھا میں کہوں گی۔ حضرت حفصہؓ نے فرمایا کہ وہ مانیں گے نہیں، مگر لوگوں کے اصرار سے دونوں ام المومنین تشریف لے گئیں اور بڑی اچھی تمہید کے ساتھ حضرت فاروقؓ سے اس بارے میں گفتگو کی۔ آپؓ سن کر رونے لگے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تنگیٔ معیشت کا ذکر کر کے ان دونوں کو بھی رُلایا اور فرمایا:

"میرے دو صاحب تھے سو میں نے
ان کو جس حالت میں دیکھا ہے اگر
میں اس حالت کے خلاف اختیار
کروں تو پھر مجھ کو ان کا ساتھ
نصیب نہیں ہو سکتا۔

یہی حالت حضرت فاروقؓ کی آخیر وقت تک رہی۔ ذرا تغیر نہ ہونے دیا۔

۶۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ایک روز بیت المال میں جھاڑو دی تو ایک درہم ملا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے کسی پوتے کو جو بالکل بچے تھے دیدیا۔ آپؓ نے بچے کے ہاتھ میں درہم دیکھ کر پوچھا، تو انہوں نے کہا کہ مجھے ابوموسیٰ نے دیا ہے۔ اس پر بہت ناخوش ہوئے اور وہ درہم واپس کر کے حضرت ابوموسیٰؓ سے فرمایا کہ لے ابوموسیٰؓ ہمارے گھر سے زیادہ کوئی گھر تم کو ذلیل نہیں معلوم ہوا۔

ایسا ہی ایک واقعہ آپ کی پوتی کا بھی ہے کہ وہ درہم کو منہ میں رکھ کر روتی ہوئی بھاگیں مگر آپؓ نے منہ میں انگلی ڈال کر وہ درہم نکال لیا۔

۷۔ آخر میں آپ پے درپے روزے رکھا کرتے تھے، سوا ان پانچ دنوں کے جن میں روزہ حرام ہے۔ کسی دن ناغہ نہ کرتے تھے۔ حج کے لئے اپنی خلافت کے پہلے سال یعنی ۱۳ھ میں تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا۔ اور اس کے بعد پھر ہر سال خود تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اپنی خلافت میں دس حج کئے اور ۲۳ھ میں جو ان کی خلافت کا آخری سال تھا، ازواج مطہرات کو بھی حج کرانے لے گئے تھے، طبقات جلد ۳۔ عمرؓ نے اپنی خلافت میں تین حج ادا کئے۔ ایک رجب ۱۷ھ میں، دوسرا رجب ۲۱ھ میں، تیسرا رجب ۲۲ھ میں، طبقات

۸۔ خشیت الٰہی اور خوف آخرت کی یہ حالت تھی کہ شائد اس صفت میں کوئی انکا مساوی نہ نکلے۔ ایک روز سورۂ اذا الشمس کورت تلاوت کر رہے تھے جب اس آیت پر پہنچے واذا الصحف نشرت تو بے ہوش ہو کر گر پڑے اور کئی دن تک ایسی حالت رہی کہ لوگ عیادت کو آتے تھے۔

ایک دن کسی گھر کی طرف گذر ہوا۔ وہ شخص نماز میں سورۂ والطور پڑھ رہا تھا۔ جب وہ اس آیت پر پہنچا: ان عذاب ربک لواقع تو سواری سے اترے اور دیوار سے ٹیک لگا کر دیر تک بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اپنے گھر آئے تو ایک مہینہ تک بیمار رہے۔ لوگ دیکھنے کو آتے تھے اور بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

۹۔ حضرت عمرؓ نے ایک مقام پر لشکر بھیجا۔ اس لشکر کے سردار حضرت ساریہؓ تھے۔ جب وہ لشکر وہاں پہنچا اور مقابلہ ہوا، تو دشمن نے دھوکہ دینے کی یہ تدبیر نکالی کہ ایک پہاڑ کی

کھو میں کچھ لوگ متعین کر دیئے تاکہ عین موقع پر کام دیں۔ جب لڑائی شروع ہو گئی تو قریب تھا کہ حضرت ساریہؓ دھوکا کھا جائیں اور مغلوب ہو جائیں۔ اتنے میں ایک آواز آئی:

یاساریہ الجبل یاساریہ الجبل

یعنی اے ساریہ پہاڑ کی طرف سے ہوشیار۔ یہ آواز سن کر وہ ہوشیار ہو گئے۔ یہ آواز حضرت عمرؓ نے جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے دی تھی جس کو انہوں نے سینکڑوں میل دور سے سُنا۔

۱۰۔ حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں رات کو گشت فرمایا کرتے تھے، اور پہرہ دیا کرتے۔ ایک مرتبہ شب میں چلتے چلتے تھک گئے تو ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت سُنا کوئی عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ دودھ میں پانی ملا دے۔

لڑکی نے جواب دیا اماں جان آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین کا کیا حکم ہے۔ کہا امیر المؤمنین نے اعلان کرایا ہے کہ کوئی شخص دودھ میں پانی نہ ملائے۔

ماں نے کہا پانی ملا دے، یہاں پر تجھے نہ عمرؓ دیکھ رہے ہیں نہ ان کا منادی۔

لڑکی نے کہا خدا کی قسم میں ایسا ہرگز نہ کروں گی کہ سامنے تو امیر المؤمنین کی اطاعت کروں اور ان کے پیچھے ان کی نافرمانی۔

۱۱۔ ایک مرتبہ حضرت علبہ ابن فرقد نے حضرت عمرؓ سے ان کی غذا کی نسبت کچھ کہا۔ آپؓ نے فرمایا: مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے حصہ کی نعمت دنیا میں کھا لوں اور اس سے فائدہ کبھی حاصل کر لوں۔

۱۲۔ حضرت عبید اللہ بن عمران بن حفص فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے پانی کی مشک بھر کر اپنے کندھے پر اٹھائی۔ اس کے متعلق لوگوں نے کچھ کہا تو فرمایا:

مجھے اپنا نفس اچھا نظر آنے لگا
اس لئے میں نے اس کو ذلیل
کرنا چاہا۔

۱۳۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کا کوئی لڑکا کنگھی کر کے اور عمدہ کپڑے پہن کر آپ کے پاس آیا۔ آپؓ نے اسے یہاں تک درّے سے مارا کہ وہ رونے لگا۔ حضرت حفصہ نے دریافت کیا کہ آپؓ نے اسے کیوں مارا۔ فرمایا میں نے دیکھا کہ وہ اپنے نفس پر اترا رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس کے نزدیک اس کا نفس ذلیل و خوار ہو جائے۔

۱۴۔ ایک مرتبہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کرنے کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے میرے بھائی! مجھے کبھی دُعا
میں یاد رکھنا۔

۱۵۔ حضرت عمرؓ کی عادت شریفہ تھی کہ درہ لے کر مذبح میں تشریف لے جاتے اور جس کو دیکھتے کہ متواتر دو روز تک گوشت خریدنے آیا ہے تو اس کی درّہ سے خبر لیتے اور فرماتے کہ:

اپنے پیٹ کو اپنے پڑوسی اور
رشتہ داروں کے لئے خالی نہیں
رکھا جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ پڑوسیوں
کی بھی ضرورت پوری کرتے رہا
کرو۔ ہر وقت اپنے ہی پیٹ کے
دھندے میں نہ لگے رہا کرو۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی خلفائے راشدین کے نقش و قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بقیہ: دیوبند

٭ نئی صدی کی قیادت کے لئے عالمِ اسلام کو تیار کرنے کے واسطے اسلامی علوم (دینی و دنیاوی) کی ترقی کا سو سالہ پلان تیار کرنا اور قدیم بنیادوں پر تعلیم کی نئی عمارت تیار کرنا۔ یہ پلان پچیس پچیس سال کے زمانوں پر چار حصوں پر مشتمل ہوگا۔ اس پلان کو مختلف زبانوں میں شائع کر کے امّت کے علمی اور تعلیمی داروں تک پہنچانا تاکہ دنیا بھر کے مسلمان علم کے تمام گوشوں میں تیز رفتار ترقی کر سکیں اور گزشتہ صدی کی جہالت کی ظلمت کو علم کی روشنی سے بدل سکیں۔

٭ دنیاوی تعلیم کے لئے ایسا خاکہ مرتب کرنا جو دینی تعلیم کے سرچشمے سے فیضیاب ہو سکے اور دینی مدرسوں کو ضروری عصری علوم کی بنیادی معلومات مہیا کر سکیں۔

٭ ساری دنیا کے سامنے خیر القرون کے اسلامی علوم۔ قرآن، تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اسلامی، علم الکلام، علم تصوف (اصلی) کی اہمیت اور ان کی کئی سو سالہ افادیت کا جامع تعارف کروانے کے لئے مختلف زبانوں میں کتابچوں کی اشاعت تاکہ نری مادیت کی فریب خوردہ اور حقیقت کی تلاش میں بُری طرح سرگرداں بھٹکی ہوئی انسانیت ایک بار پھر اسلام کے جادۂ مستقیم کی طرف پلٹ سکے اور پہلے مقصدِ حیات متعین کر کے پھر علومِ فطرت کو اس دنیا کے لئے نافع اور مفید بنا سکے۔

٭ دنیا کے تمام اسلامی اداروں اور فرقوں کے علماء سے اپیل کرنا کہ قدیم مسائل پر جدید علم الکلام کی طاقت سے اخلاقی اجتہاد سے ایسی اعتقادی بنیادیں تلاش کریں جن سے اسلامی دنیا کے مذہبی اختلافات ختم ہو سکیں اور دنیا بھر میں اسلامی معاشرہ کے مختلف فرقے متحد ہو کر اپنی زندگی کی تعمیر کے ساتھ دنیا بھر کے انسانوں اور قوموں کی بہبود کے لئے کام کر سکیں اور خیر القرون کا نمونہ پیش کر سکیں۔

٭ قصرِ انسانیت کا سنگِ بنیاد وحدتِ ملی ہے —— وحدتِ ملی کی تکمیل کے بعد وحدتِ انسانی کا حصول دوسرا مقصد ہے۔

٭ موجودہ اخلاقی اور عام مذہبی زوال و انحطاط کے پیشِ نظر دنیا کی قوموں کے لئے ایک کائناتی اخلاقی نظام کی بنیادیں تلاش کرنا۔

٭ تمام دنیا کی قوموں کے لئے اسلامی اصولوں پر مبنی اخلاقی و انسانی چارٹر (منشور) تیار کرنا۔

یہ چارٹر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، انسان کی روحانی عظمت و بہبودی، حقیقی، معاشی و معاشرتی مساوات کے نکات پر مشتمل ہوگا۔ اس چارٹر کو عربی، اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی میں چھپوانا۔ یہ چارٹر عالم اسلام کے مفکرین